تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ ایس۔ اُردو

علی اکبر ناطق کے ناول "نولکھی کوٹھی" کا نو آبادیاتی تناظر میں مطالعہ

محقق:

عائشہ فاطمہ

236-FLL/MSURDU/F19

نگران:

ڈاکٹر صباحت مشتاق

لیکچرر، شعبۂ اردو (خواتین)

شعبۂ اردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

سنٹر
Accession No. TH25595

MS
89.4393
ع ا ع

اردو ادب - ناول
" " " - نوآبادیاتی تناظر

بسم الله الرحمن الرحيم

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **AYESHA FATIMA**

Title of the Thesis: **علی اکبر ناطق کے ناول "نولکھی کوٹھی" کا نوآبادیاتی تناظر میں مطالعہ**

Registration No: **236-FLL/MSURD/F19**

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Kamran Abbas Kazmi
Chairperson
Department of Urdu
Islamabad

External Examiner:

Dr. Salah Uddin Derwaish
Associate Professor
Federal College, H-9
Islamabad

Internal Examiner:

Dr. Saira Batool
Assistant Professor
Department of Urdu, IIUI,
Islamabad

Supervisor:

Dr. Sabahat Mushtaq
Lecturer
Department of Urdu, IIUI
Islamabad

E-STAMP

E-Stamp ID :	PB-RWP-E9AA47CCAEEF6539
Stamp Type:	Low Denomination
Amount:	100/-
Description:	Agreement
Applicant:	AYESHA FATIMA[38302-2861560-4]
D/O:	MUHAMMAD ASLAM KHAN
Address:	ISLAMABAD
Issue Date:	16-08-2022
Delisted On/Validity:	23-08-2022
Amount in Words:	One Hundred Rupees Only
Reason:	Undertaking for missing challan
Vendor Information:	USAID AHSAN | PB-RWP-533 | MAIN GT ROAD KSSI RAWALPINDI

نوٹ :یہ ٹرانزیکشن تاریخ اجرا سے سات دنوں تک کے لیے قابل استعمال ہے۔

﴿بیان حلفی﴾

منکہ مسماۃ عائشہ فاطمہ دختر از محمد اسلم خان رجسٹریشن نمبر 236-FLL/MSURDU/F19 شعبہ اردو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد میں برائے ایم فل کی سکالر ہونے کی حیثیت سے اپنا مقالہ بعنوان علی اکبر ناطق کے ناول "نولکھی کوٹھی" کا نوآبادیاتی تناظر میں مطالعہ نگران استاد ڈاکٹر [illegible] مکمل کیا ہے۔

مسماۃ عائشہ فاطمہ دختر از محمد اسلم خان اس بات کا حلفاً اقرار کرتی ہوں کہ مقالہ ہذا ہر قسم کے سرقہ سے پاک ہے۔

مسماۃ عائشہ فاطمہ نے مقالہ ہذا کو کسی اور ڈگری کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ ہی آیندہ کروں گی۔ ان تمام حقائق کا اقرار کرتی ہوں کہ میں نے کوئی امر مخفی نہیں رکھا۔ لہٰذا غلط بیانی کی صورت میں ہر قسم کی ذمہ داری مسماۃ پر عائد ہوگی۔

درج بالا تمام کوائف میرے علم و یقین کے مطابق درست تحریر ہیں اور کوئی امر مخفی نہ رکھا گیا ہے۔

العبد

عائشہ فاطمہ ولدیت محمد اسلم خان

رجسٹریشن نمبر: 236-FLL/MSURDU/F19

شناختی کارڈ نمبر: 38302-2861560-4

شعبہ: اردو

الجامعة الإسلامية العالمية

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ عائشہ فاطمہ رجسٹریشن نمبر 236.FLL/MSURDU/F19 نے ایم۔ایس۔ اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان **"علی اکبر ناطق کے ناول "نولکھی کوٹھی" کا نوآبادیاتی تناظر میں مطالعہ"** میری نگرانی میں رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر صباحت مشتاق

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو

پیش لفظ

جب کوئی طاقت ور ریاست خود سے کمزور ریاست پر جا کر اپنی طاقت کے بل بوتے پر ان پر حکمرانی کرتی ہے اور وہاں کے قدرتی وسائل اور افراد کی قوت کو اپنے اقتصادی و معاشی ترقی کے لیے استعمال کرتی ہے تو وہ مقبوضہ ریاست قابض ریاست کی نو آبادی کہلاتی ہے۔ تجارت، صنعت و حرفت اور معاشی شعبوں کے علاوہ مقبوضہ ریاست کے تمام تر شعبے یہاں تک کہ حکومتی نظام چلانے والے ادارے بھی اپنے قبضے میں کر لیے جاتے ہیں اور مقبوضہ ریاست پر حکومت کی جاتی ہے جس کے لیے وہ اپنی فوجی طاقت کا استعمال بھی کرتی ہے۔ غالب ریاست، مغلوب ریاست سے معاشی اور معاشرتی میدان میں ترقی یافتہ ہوتی ہے اس لیے وہ خود کو ان سے بہتر حاصل سمجھتی ہے۔ اسی ترقی کی وجہ سے غالب ریاست میں مزید کمزور ریاستوں پر حکومت کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ وسائل سے استفادہ کر کے خود کو مزید ترقی یافتہ ممالک میں شامل کرے اور اسی طرح ترقی کرتی جائے۔

۱۸۵۷ء ہندوستان کی تاریخ کا اہم سال ہے۔ جب انگریزوں نے مغلوں کی حکومت چھین لی اور خود ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ اقتدار اعلیٰ تاج برطانیہ نے سنبھالا اور ہندوستان برطانیہ کی نو آبادی بن گیا جس کا انتظام و انصرام لندن کابینہ کے ہاتھوں چلا گیا اور ہندوستان پر انگریز افسران حکومت کرنے لگ گئے۔

زیرِ نظر مقالے کا موضوع ''علی اکبر ناطق کے ناول ''نولکھی کوٹھی'' کا نو آبادیاتی تناظر میں مطالعہ'' ہے۔ اس موضوع کے انتخاب پر ڈاکٹر صباحت مشتاق سے کافی مشاورت ہوئی۔ نگران نے نہ صرف موضوع کے انتخاب میں میری مدد فرمائی بلکہ مقالے کی ابواب بندی، وسعت اور زیرِ ممکنہ مشکلات پر سیر حاصل گفتگو فرمائی جو میرے لیے مقالے کے دوران مشعلِ راہ ثابت ہوئی۔ اس مقالے کو تحقیق کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے چار ابواب میں تقسیم کیا گیا۔

باب اول میں نو آبادیاتی کا تعارف، تعریف اور نو آبادیات کے تصورات کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں نو آبادیاتی نظام کے تناظر میں منتخب ناولوں کو بھی بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ باب اول کے دو حصے ہیں جس کے پہلے حصے میں نو آبادیات کا تعارف اور اس کا پس منظری مطالعہ کیا گیا ہے۔ باب کے دوسرے حصے میں البرٹ میمی کے نظریات اور منتخب اردو ناولوں میں نو آبادیات کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

باب دوم میں علی اکبر ناطق کے سوانحی حالات درج ہیں جس میں ان کا خاندان، پس منظر، پیدائش، تعلیم اور ان کی تصانیف درج ہیں۔ اس کے بعد اسی باب میں ناول ''نولکھی کوٹھی'' کے کرداروں کو پیش کیا گیا ہے اور ان کی فکر پر نو آبادیاتی اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب سوم میں "نولکھی کوٹھی" کے اسلوب کا نو آبادیاتی تناظر میں مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس باب میں "نولکھی کوٹھی" کی اسلوبیاتی خصوصیات کو پیش کر کے ناول میں علی اکبر ناطق کے منفرد اسلوب پر بحث کر کے اسلوب سے متعلق مختلف گوشوں کو عیاں کیا ہے۔

باب چہارم میں "نولکھی کوٹھی" میں نو آبادیات کے خلاف مزاحمتی عناصر کو پیش کیا گیا ہے۔ ظلم و استحصال کے خلاف مزاحمتی رویوں کو اقتباسات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ قومی آزادی کے لیے ہونے والی تحریکوں کے واقعات مزاحمتی رویوں کی عکاسی کرتے ہیں۔

اس مقالے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں سب سے پہلے میں اپنے اللہ تعالیٰ کی شکر گزار ہوں جس نے مجھے ہمت اور حوصلہ دیا کہ میں اس مقالے کو مکمل کر سکوں۔ مقالے کی تکمیل میں اہم کردار میری نگران ڈاکٹر صباحت مشتاق کا ہے۔ انھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے مفید مشوروں سے مجھے نوازا۔ میں تاحیات اس شفیق اور مہربان ہستی کی ممنون رہوں گی۔

اس کے بعد ان اساتذہ کا شکریہ واجب ہے جنھوں نے میرے ایم۔ایس۔ کے مقالے میں مجھے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ اس کے لیے میں اپنی اساتذہ ڈاکٹر غلام فریدہ اور ڈاکٹر سائرہ بتول کی دل سے شکر گزار ہوں۔ اس کے علاوہ اپنی پُر خلوص دوست سیدہ ام الشعاع کی تہہِ دل سے شکر گزار ہوں جس نے میرے مقالے کی تکمیل میں میری مدد کی اور اس کے ساتھ ساتھ مقالے میں اضافے کی تجاویز بھی دی۔ آخر میں اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ میری ان تمام اساتذہ اور احباب کو جزائے خیر عطا کرے جن کی وجہ سے میرا مقالہ پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ (آمین)

عائشہ فاطمہ

اگست ۲۰۲۲ء

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
۱۔	**باب اوّل:**	
	نو آبادیات کا تعارف	۱
	۱۔ نو آبادیات کی تعریف اور پس منظری مطالعہ	۱
	۲۔ البرٹ میمی (Albert Memmi) کے نظریات اور منتخب اردو ناولوں میں	
	نو آبادیات کا مطالعہ	۱۷
	حوالہ جات	۳۹
۲۔	**باب دوم:**	
	نولکھی کوٹھی کے کرداروں کی فکر پر نو آبادیاتی اثرات کا جائزہ	۴۲
	حوالہ جات	۶۹
۳۔	**باب سوم:**	
	نولکھی کوٹھی کے اسلوب کا نو آبادیاتی تناظر میں مطالعہ	۷۲
	حوالہ جات	۱۰۱
۴۔	**باب چہارم:**	
	نولکھی کوٹھی میں نو آبادیات کے خلاف مزاحمتی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ	۱۰۵
	حوالہ جات	۱۳۲
	ماحصل	۱۳۵
	کتابیات	۱۳۹

باب اوّل:

نو آبادیات کا تعارف

باب اوّل:

نو آبادیات کا تعارف

حصہ الف: نو آبادیات کی تعریف اور پس منظری مطالعہ

نو آبادیات کی تعریف:

نو آبادیاتی نظام سے مراد ایک ریاست کا کسی دوسری ریاست میں جا کر اپنی آبادیاں قائم کرنا اور دوسری ریاست کو ہر سطح سے مغلوب کرنے کی کوشش کرنا۔ اس ریاست پر اپنے قوانین اور حکومت مسلط کرنا اور وہاں کے قدرتی وسائل اور افراد کی قوت کو اپنے مفاد اور اپنی معاشی ترقی کے لیے استعمال کرنا ہے، غالب ریاست کو ہر سطح پر فائدہ میسر ہوتا ہے۔

نو آبادیات ایک ایسا نظام ہے جس میں طاقت ور ملک کمزور ملک پر براہِ راست اپنا تسلط قائم کر لیتا ہے۔ اپنی حکومت کو وسعت دے کر دوسرے علاقوں پر قبضہ کیا جاتا ہے تا کہ مقامی آبادی کی افرادی قوت اور وسائل پر قبضہ کر کے ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ مقبوضہ علاقے کے وسائل کو اپنے علاقوں میں منتقل کر دیا جاتا ہے تا کہ ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا جا سکے اور مقبوضہ علاقے کو ایسے خطے میں تبدیل کر دیا جاتا ہے جس کا تمام تر انحصار قابض علاقے پر ہو جاتا ہے۔ *Collins Dictionary* میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

> Colonialsim is the practice by which powerful country directly control less powerful countries and use their resources to increase its own power and wealth.[1]

ڈکشنری آف دی انگلش لینگویج کے انسائیکلوپیڈیا ایڈیشن میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ:

> The Policy of nation seeking to acquire extend or retain overseas dependcies.[2]

اس کے برعکس *Penguin Dictionary of Literary Terms* میں نو آبادیاتی طرزِ عمل کو اس طرح سے بیان کیا گیا ہے:

> نو آبادیات ایک ایسے طریقہ کار کا نام ہے جس کے ذریعے صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک خصوصاً

انگلستان، فرانس، ہالینڈ، جرمنی، اٹلی، امریکہ دنیا کے باقی خطوں افریقہ، ایشیا، ساؤتھ امریکہ اور مشرقِ وسطیٰ کی منڈیوں اور خام مال پر اپنا حق ملکیت حاصل کرکے اس کا استحصال کرتے ہیں۔[۳]

اگر ہم نوآبادیات کی مختصر تعریف کرنے کی کوشش کریں تو وہ کچھ اس طرح سے ہوگی کہ کسی غیر ملکی طاقت کا اپنی سرحدی حدود سے باہر نکل کر دوسری اقوام کے اقتدار کو ختم کرنا اور وہاں خود کو مستحکم کرنا اور وہاں کے لوگوں کے حقوق کا استحصال کر کے خود کو مضبوط بنانا نوآبادیات کہلاتا ہے۔ ایڈورڈ سعید اپنی کتاب ثقافت اور سامراج میں اس کی تعریف کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> سامراجیت کا مطلب اپنے تصرف سے باہر کی، دور دراز اور دوسروں کی زیرِ ملکیت زمین کے متعلق سوچنا، وہاں آباد اور قابض ہونا ہے۔[۴]

نوآبادیاتی نظام کے حمایتی اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ کمزور ریاستوں کو سہولیات مہیا کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی حالت بہتر کر سکتے ہیں۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے وہ کمزور ریاستوں پر قبضہ کر کے خود کی اور اپنی معاشی ترقی کو مضبوط کر رہے ہوتے ہیں۔ کمزور ریاست کے تمام تر شعبے اپنے قبضے میں کر لیتے ہیں اور اس کے لیے وہ اپنی فوجی طاقت کا استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

قابض ریاست مقبوضہ ریاست کے مال، قدرتی وسائل اور ان کی افرادی قوت پر قبضہ کرتی ہے۔ صرف یہ ہی نہیں مقبوضہ ریاست کے تمام شعبوں پر قابض ہو کر اور انھیں استعمال میں لا کر اپنی معاشی صورت حال کو مضبوط کرتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ کمزور ریاست کے حکومتی امور بھی اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ یہ مقبوضہ ریاست سے ہر طرح سے مضبوط ہوتی ہے۔ اس لیے وہ خود کو ان سے برتر سمجھتی ہے جس کی وجہ سے اس میں دوسری ریاستوں پر قبضہ کرنے کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔ اس طرح وہ دن بدن مضبوط سے مضبوط تر ہو جاتی ہے اور مزید ترقی یافتہ ریاستوں میں شامل ہو جاتی ہے۔ ناصر عباس نیر لکھتے ہیں کہ:

> نوآبادکار اپنی شخصیت، اپنی ثقافت، اپنے علمی ورثے، اپنے سیاسی نظریات، اپنے فنون کے بارے میں جو آرا پھیلاتا ہے، وہ نوآبادیاتی دنیا کے افراد کی شخصیت، ثقافت، علم اور فنون کے متعلق موجود آرا کے متضاد اور انھیں بے دخل کرنے والی ہوتی ہیں۔[۵]

تاریخِ عالم میں ریاستوں کی توسیع کے دوران کمزور ریاستوں پر قبضہ ایک عام روایت ہے۔ کمزور ریاستوں کو غلامی کے عذاب جھیلنا پڑتے ہیں اور تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ زمانہ قدیم میں رومیوں کی فتوحات اس ضمن میں اہم مثال ہے۔ نوآبادیاتی نظام میں کسی کمزور ریاست کا استحصال ہی نہیں کیا جاتا بلکہ ان کی نفسیاتی اور اخلاقی زندگی کو بھی بری طرح متاثر کیا جاتا ہے۔ انھیں ہر طرح سے خود سے بدتر سمجھا جاتا ہے۔ اس نظام

کے تحت کالونائزر (Coloniser)، کالونائزڈ (Colonised) ریاست کے قدرتی وسائل سے استفادہ تو کرتی ہے مگر ان کے حقوق کا تحفظ نہیں کرتی۔ وہ صرف اپنے ذاتی مفاد سامنے رکھتی ہے۔ اس وجہ سے دونوں ریاستوں میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ قابض ریاست انھیں ہر طرح سے کم تر سمجھتی ہے۔ ان کے رہن سہن، ثقافت، روایات یہاں تک کہ ان کے مذہب کو بھی کم تر سمجھا جاتا ہے۔

> Many Colonial rulers forced their way of life on the people of their colonies. They did so partly because they considred the culture of the colonial people inferior to their own. Many rulers tried to convert the colonial. They also made their own language, the official language of the colonies. In many cases colonial rulers tries to replace the native culture with their own culture.[1]

نو آبادیاتی نظام کی مجموعی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے اشفاق سلیم مرزا نے چند نکات پیش کیے ہیں جن کو ہندوستانی تناظر میں دیکھیں تو سب چیزیں کھل کر سامنے آجاتی ہیں۔

ا۔ نو آبادیوں پر قبضہ کرنے کے بعد نو آبادکار ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وہاں کی اقتصادی ترقی کو ایک حد سے زیادہ بڑھنے نہیں دیتے تا کہ وہ اپنے اقتدار کو باسہولت قائم رکھ سکیں۔ سامراج نو آبادیوں پر قبضہ تہذیب سکھانے نہیں بلکہ اقتصادی منافع کے لیے وہ اپنے اقتدار کو قائم رکھتا ہے۔

۲۔ ٹیرف اور دوسری تجارتی پابندیوں کی پالیسی کو اپناتے ہوئے مغربی سرمایہ دار گھٹیا قسم کی اشیا کو زیادہ منافع پر بیچتے ہیں۔

۳۔ وہ نو آبادیات میں قائم مختلف صنعتوں کی حوصلہ شکنی کرنے کے بعد ان کے زوال پذیر ہونے کے لیے راہ ہموار کرتے ہیں۔ وہ اپنی اشیاء کی کھپت کے لیے مقامی دست کاریوں اور روایتی اہل حرفہ کی بھی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔

۴۔ سرمایہ دارانہ اجارہ داریاں نو آبادیاتی منڈیوں سے زیادہ سے زیادہ خام مال سستے داموں اٹھاتی ہیں۔ خام مال پر قبضہ کرنے کے بعد بین الاقوامی منڈی میں اس کی قیمت کا تعین بھی خود کرتی ہیں تا کہ اپنی مرضی سے منافع کی شرح بڑھا سکیں۔

۵۔ نو آبادیوں کو اپنی دفاعی ضرورت کے تحت استعمال کرتے ہوئے وہاں اپنے اڈے قائم کرتے ہیں۔

۶۔ لوگوں کی محنت کو ارزاں قیمت پر خریدا جاتا ہے اور تعلیم ان کے لیے وہی روا رکھی جاتی ہے جو ان کے کام آ سکے۔[۷]

نو آبادیاتی نظام میں قابض اور مقبوضہ ریاستوں میں ایک خاص رشتہ قائم کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے پہل انگریز ہندوستان میں آئے تو مقامی ثقافت سے متاثر ہوئے اور ہندوستان کی عورتوں سے شادیاں بھی کیں۔ تعلقات مضبوط کیے، جب تک انھیں اپنی راہ ہموار نہ لگی انھوں نے وہاں کی ثقافت کو اپنایا اور اسی میں رچ بس گئے۔ جب سیاسی تسلط قائم کرنے کی راہ ہموار ہو گئی تو انھوں نے مقامی لوگوں سے فاصلہ اختیار کر لیا۔ نو آبادکار کو اعلیٰ انسان تصور کرتے ہیں اور کرواتے ہیں جب تک وہ ایسا نہیں کرتے ان کے لیے ان کا استحکام قائم رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے استعمار زدہ ذہنی طور پر اتنا مفلوج ہو جاتا ہے کہ وہ کسی طرح نو آبادکار کا وفادار ثابت ہو جائے، خود کو ان جیسا بنانا چاہتا ہے۔

نو آبادیاتی صورت حال دو دنیاؤں کو تشکیل دیتی ہے۔ ایک نو آبادکار کی دنیا اور دوسری مقامی باشندوں کی دنیا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہوتی ہیں۔ نو آبادیاتی نظام میں دو کی تقسیم کا اختیار نو آبادکار کے پاس ہوتا ہے۔ اس تقسیم کے تحت وہ اپنے اختیارات کا مظاہرہ ہی نہیں کرتا بلکہ اپنے اختیارات کو بڑھاتا بھی ہے۔ نو آبادکار اپنی قیام گاہوں، اپنے دفاتر اور چھاؤنیوں سے مقامی باشندوں کو دور رکھتا ہے اور انھیں ان کے آس پاس پھٹکنے کی کوئی اجازت نہیں ہوتی۔ ''کتوں اور ہندوستانیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔'' کی تختی جگہ جگہ پر لگی ہوتی ہیں۔ نو آبادکار خود کو مختلف طریقوں سے خود کو ممتاز ہونے کا تاثر ابھارتا رہتا ہے۔ اس طرح نو آبادکار کی طاقت میں مسلسل اضافہ ہوتا ہے۔ نو آبادکار کی طاقت میں جس قدر اضافہ ہوتا ہے، مقامی باشندوں کی طاقت اسی تناسب سے گھٹتی ہے۔

نو آبادکار صرف دو دنیاؤں میں تقسیم نہیں کرتا بلکہ مقامی باشندوں کی دنیا کو خود ہی تشکیل دیتا ہے۔ نو آبادیاتی باشندوں کی دنیا اپنی دنیا نہیں ہوتی، ان کا اس دنیا پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اس دنیا کے کسی بھی معاملے میں ان کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ہی دنیا میں ''اجنبی'' کی طرح رہتے ہیں۔ نو آبادیاتی باشندوں کو نو آبادکار جو تصورات دیتا ہے انھیں وہ قبول کر لیتے ہیں اور اسی کے مطابق جینے لگتے ہیں۔ اسی وجہ سے نو آبادیاتی نظام قائم رہتا ہے۔ نو آبادکار خود کو انسانی پیمانے کی مثال کے طور پر پیش کرتا ہے۔ نو آبادیاتی باشندوں کو جاہل اور حیوان کہلوانے سے یہ بات ثابت کرتا ہے کہ انھیں آگے بڑھنے کی کوئی جستجو نہیں ہے۔ ان کے پاس علوم نہیں ہیں۔ یہاں نو آبادکار اپنے علوم اور جستجو کو بطور نمونہ پیش کرتا ہے۔

نو آبادکار اور نو آبادیاتی باشندوں دونوں کو اپنی حیثیت سے آگاہی ہوتی ہے۔ نو آبادکار خود کو آقا اور برتر ہونے کا شعور رکھتا ہے اور نو آبادیاتی باشندہ خود کو محکوم اور بے بس مان لیتا ہے مگر دونوں کے درجے یکساں نہیں

ہوتے۔ نو آبادکار کو اس کا یہ درجہ اسے اور مضبوط اور مستحکم بناتا ہے۔ اس طرح وہ پہلے سے زیادہ وسائل کی تلاش میں مصروف رہتا ہے مگر نو آبادیاتی باشندوں کو جو درجہ دیا جاتا ہے اس سے وہ پہلے سے بھی زیادہ محکوم، محدود اور بے بس ہو جاتا ہے اور غلامی کو اپنا مقدر مان لیتا ہے۔

نو آبادیاتی باشندوں کا نو آبادکار کو تسلیم کرنا دراصل اپنی نفی ہے لیکن اس عمل میں اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ نہ تو وہ مکمل طور پر اسے تسلیم کر سکتا ہے اور نہ ہی اسے رد کر سکتا ہے۔ وہ اس جیسا بننے کی کوشش کرتا ہے مگر اس جیسا بن نہیں پاتا۔ کیوں کہ نو آبادکار اسے کبھی خود جیسا نہیں بننے دیتا۔ اگر ایسا ہو تو پھر نو آبادیاتی تسلط قائم نہیں ہوتا۔ ہاں نو آبادیاتی باشندہ اس جیسا بننے کے خواب ضرور دیکھتا ہے، پر نو آبادکار اس کا یہ خواب پورا نہیں ہونے دیتا۔

ان تمام حالات کی روشنی میں نو آبادکار خود کو اعلیٰ تہذیب اور اعلیٰ تعلیمی سیاسی شعور رکھنے والے افراد کے طور پر پیش کرتا ہے۔ نو آبادیات باشندوں پر اپنی حکومت کو مضبوط کرنے کے لیے نو آبادکار ان کے رہن سہن، تہذیب، تعلیم، علوم و فنون کا مطالعہ نو آبادیاتی ضرورت کے تحت کرتا ہے کہ جس سے اسے مزید طاقت مل سکے۔ وہ وہاں کے علوم و فنون سیکھتا ہے مگر انھیں یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ نو آبادیاتی باشندوں کے علوم و فنون بہت پس ماندہ اور روایتی ہیں جن کی موجودہ دور میں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نو آبادکار یہ سب اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنے علوم و فنون کو فروغ دینے کے لیے کرتا ہے۔ طاہر کامران کے خیال میں:

> ہندوستان کی معاشرتی اقدار کو توہم پرستی، تلذذ اور غیر انسانی رسوم سے عبارت قرار دے کر مسترد کر دیا گیا اور اس خیال کو رواج دینے کی حتی المقدور کوشش کی گئی کہ مشرق کی غیر متمدن عوام کو تہذیب و تمدن سے آشنا کرنے کی ذمہ داری انگریزوں کو خدا نے سونپی ہے۔[۸]

نو آبادکار مقامی باشندوں کو جو تعلیم دیتے ہیں، اس میں بھی وہ اپنے مفاد کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ مقامی باشندوں کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے جن سے نو آبادکار کو فائدہ حاصل ہو۔

پس منظر:

پہلے پہل ہندوستانی تجارتی مال بحیرہ قلزم اور بحیرہ روم کے راستے سے یورپی ممالک تک پہنچتا تھا۔ ترکوں نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ اور اس کے بعد مصر پر قبضہ کیا تو یہ راستے ترکوں کے قبضے میں چلے گئے۔ اس لیے یورپی اقوام نے کوئی دوسرا بحری راستہ دریافت کرنے کی ٹھان لی جس کا سہرا پرتگالیوں کے سر ہے۔ پرتگالیوں کی دیکھا دیکھی ولندیزی اور انگریز بھی ہندوستان آنے لگے۔

پرتگیزی نوآبادیات:

برصغیر میں نوآبادیاتی نظام کا آغاز ۱۴۹۸ء میں ہوا۔ جب پہلا یورپی پرتگالی جہاز ران واسکوڈے گاما ہندوستان کی بندرگاہ پہ پہنچا جس سے ہند اور پرتگال کے تجارتی روابط شروع ہوئے۔ واسکوڈے گاما ۱۴۹۸ء میں جب کالی کٹ پہنچا تو اس نے اپنے بحری جہاز پر وہاں کے مقامی ماہی گیروں کو مدعو کیا اور اپنا کچھ سامان وہاں تجارت کے لیے لایا۔ کالی کٹ کے راجہ سے اجازت کے لیے اپنے دو خاص بندوں کو بھیجا مگر پرتگالی تاجر ان اشیا کے واجبات اور قیمت سونے کی شکل میں ادا کرنے کے قابل نہیں تھے۔ کالی کٹ کے حکام نے ادائیگی کے لیے ضمانت کے طور پر واسکوڈے گاما کے آدمیوں کو قید کر لیا جس پر واسکوڈے گاما کو بہت غصہ آیا اور اس نے طاقت کے ذریعے اپنے آدمیوں کے ساتھ مل کر مقامی ماہی گیروں کو قید کر لیا اور انھیں بہت وحشیانہ طریقے سے قتل کر کے ساحل پر پھینک دیا۔ اس میں وہ اچھی طرح سے کامیاب رہا۔ اس نے سامان تجارت کی فروخت سے ۶۰ گنا زیادہ کمایا۔ اگلی کئی دہائیوں تک پرتگیزی جہاز ران مشرقی ایشیا کے ساحلوں سے گزرتے تو وہاں پر اپنے تجارتی مقامات بناتے گئے۔

ولندیزی نوآبادیات:

۱۵۸۰ء سے ۱۶۴۰ء کے دوران پرتگال ہسپانیہ کے ساتھ اتحاد میں تھا۔ پرتگیزی نوآبادی کو تین یورپی قوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ولندیزی، انگریزی اور فرانسیسی کم آبادی کے باعث پرتگال اپنے تجارتی مقامات اور کارخانوں کی حفاظت نہ کر سکا اور اس طرح زوال کا شکار ہو گیا۔ ولندیزی باشندوں نے ۱۶۰۲ء ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ایک تجارتی تنظیم بنائی۔ حکومتی سرپرستی کے بل بوتے پر اسے بہت فروغ ملا۔ ولندیزیوں نے پرتگالی تاجروں پر خوب ہاتھ صاف کیے۔ پھر انگریزی اثر و رسوخ بڑھنے لگا اور ولندیزی انڈونیشیا کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں غلامی عروج پر تھی۔ پرتگیزیوں نے سب سے پہلے غلاموں کی تجارت کی۔ غلاموں کو اجناس اور معنی دولت کے حصول کے لیے نوآبادیاتی طاقتوں نے اپنے معاشری مفاد کے لیے استعمال کیا۔ انھیں استعمال کرتے ہوئے سینکڑوں سالوں تک بے تحاشا دولت کمائی۔ فرانز فینن اس طرح کی کمائی ہوئی دولت کی مزمت کرتا ہے کیوں کہ ”یورپی خوش حالی اور ترقی میں عرب، ہندوستانی اور زرد فام باشندوں کے پسینے اور خون سے اضافہ کیا گیا ہے۔“[9]

نوآبادیاتی نظام کے فروغ کے سلسلے میں حکومت برطانیہ کا نام یورپی ریاستوں میں سرفہرست ہے۔ ۱۶۰۰ء سے لے کر دوسری جنگ عظیم تک برطانوی نوآبادیاں دنیا کے مختلف اطراف میں قائم رہیں۔ ملکہ وکٹوریہ کے عہد حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ ان نوآبادیوں سے آنے والے بحری جہاز خام مال اور معدنی ذخائر سے لانے

ہوتے تھے اور برطانیہ کی صنعت اور تجارت کو فروغ دے کر اسے دنیا میں ترقی یافتہ اور ایک با اثر ملک بنانے میں مصروف تھے۔ ہندوستان سے افیون، چائے، چینی، مصالحہ جات، تمباکو خام مال کی صورت میں برطانیہ پہنچائے جاتے تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی اور ہندوستان:

ہندوستان میں برطانیہ کی نو آبادی سب سے ممتاز حیثیت رکھتی ہے لیکن اسے حکومت برطانیہ نے شروع نہیں کیا تھا بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کی بنیاد رکھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۶۰۰ء میں رجسٹرڈ ہونے والی سب سے زیادہ بارسوخ کمپنی تھی جو کہ تجارتی مقاصد کی غرض سے ہندوستان میں قائم کی گئی۔ انگریز جب ہندوستان آئے تو یہاں کے ہندوستانی لباس، جواہرات، دستر خوان، غذائیں اور شاہانہ پالکیوں کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے۔ انھیں یہ سر زمین جادوئی لگتی تھی۔ وہ یہاں کی تہذیب سے بہت متاثر ہوئے۔ انسان جس چیز سے متاثر ہوتا ہے اسے اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ انگریزوں نے بھی ہندوستانی کلچر کو اپنانا شروع کر دیا۔ ان کی طرح لباس پہننا، ان کے رہن سہن کے طریقے کو اپنایا۔ یہاں تک کہ ان کی عورتوں سے شادیاں بھی کیں۔ مگر یہ ہی انگریز جب اقتدار میں آئے تو انھیں ہندوستانی کلچر کمتر اور گھٹیا محسوس ہونے لگ گیا۔ کیوں کہ برطانیہ میں موجود اکابرین کو یہ خطرہ محسوس ہونے لگ گیا کہ ان کے ملازمین بالکل ہی غیر عیسائی کلچر میں گم نہ ہو جائیں اور ہندوستانی کلچر کو ہمیشہ کے لیے نہ اپنا لیں۔ لہٰذا انھوں نے اس کلچر کو ترک کرنے کا حکم دیا کیوں کہ ان کے نزدیک:

> اگر اس کے لوگ ہندوستانی کلچر میں ضم ہو گئے تو ان کا تعلق بھی انگلستان سے ختم ہو جائے گا اور شاید ان کا وہی انجام ہو جو کہ ہندوستان میں مغلوں کا ہوا کہ وہ ہندوستانی ہو کر وسط ایشیا سے اپنی جڑیں کھو بیٹھے۔ اس وجہ سے یہ کمپنی کے مفاد میں تھا کہ فرق نہ صرف قائم رہے بلکہ اس میں شدت بھی آئے۔[۱۱]

اس وقت سیاسی اور معاشی طاقت انگریزوں کے ہاتھ میں چلی گئی تھی۔ ہندوستانی معیشت تباہ و برباد ہو گئی تھی۔ دوسری طرف برطانیہ بہت جلد ترقی کر رہا تھا۔ سیاسی اور معاشی طور پر جب وہ مضبوط ہو گئے تو کمپنی میں بھی سیاسی و معاشی اعتبار سے تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ اس مرحلے پر کمپنی کے ملازمین نے مقامی باشندوں سے دوری اختیار کر لی اور خود کو اعلیٰ تہذیب کا نمائندہ کہنے لگے۔ انھیں لگتا تھا کہ جدید ٹیکنالوجی کے ساتھ ساتھ بہترین مذہب بھی انہی کا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی باشندے بھی عیسائیت قبول کر لیں۔ اس کے لیے انھوں نے مختلف مناظرے بھی کیے اور ایسی صورت حال بنا دی کہ ہندوستانیوں کو اپنا غلام بنایا جانے لگا اور خود کو برتر کہلایا جانے لگا۔

اس کے بعد سلطنت برطانیہ کے عہد داروں نے مغلوں کی طرز پر دربار لگائے۔ ہندوستان میں ترقیاتی کاموں کا آغاز کیا۔ سڑکیں بنائیں، تعلیم و صحت کے ادارے قائم کیے۔ نہریں تعمیر کیں، عوام کو سہولیات دیں، عورت کو ووٹ دینے کا حق دیا، اس لحاظ سے آج بھی لوگ انگریزوں کے دور کو سب سے اچھا اور خوش حالی کا دور کہتے ہیں۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ انھیں ہندوستانی عوام سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ یہ سب کرنے کے پس پشت ان کے ارادے کچھ اور تھے۔ وہ اپنی جڑیں مضبوط کر رہے تھے اور اپنے ذاتی مفاد کو سامنے رکھ کر ہندوستانی عوام کے لیے یہ سب کر رہے تھے جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے اور اپنے مفاد میں آگے بڑھتے گئے۔

معاشی اعتبار سے ہندوستان میں برطانوی عہد کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارتی سرمایہ داری کے ذریعے ہندوستان میں داخل ہونے میں کامیابی حاصل کی۔ ہندوستان میں دھوکہ، جبر اور سازشوں کے تحت وہاں اپنی اجارہ داری قائم کی۔ ۱۸۱۳ء کے بعد جب برطانیہ نے کمپنی کا تجارتی اجارہ رد کر دیا تو آزاد تجارتی سرمائے نے برطانیہ کے معاشی مفادات کی بنیاد رکھی۔

دوسرے دور میں جب صنعتی سرمایہ داری کا آغاز ہوا تو برطانیہ میں صنعتی سرمایہ دار طبقے کو منڈیوں کے قابل حصول تجارتی سرمایہ داری کو بدلنے کی بہت ضرورت تھی۔ اس لیے برطانوی پارلیمان میں آزاد تجارت کے حق میں آوازیں بلند ہونے لگیں کیوں کہ:

> آزاد تجارت کے لیے کمپنی کی اجارہ داری کا خاتمہ ضروری تھا۔ ساتھ یہ بھی ضروری ہو گیا تھا کہ ہندوستان سوتی کپڑا برآمد کرنے والا ملک نہ رہے بلکہ انگلستان میں قائم ہونے والے کارخانوں سے تیار شدہ کپڑا درآمد کرے۔[۱۱]

سلطنت برطانیہ کی طرف سے کمپنی کو کمزور کرنے کا مقصد انگلستان کے بڑھتے ہوئے سرمایہ دار طبقے کے لیے ہندوستان پر حکومت کرنے کے دروازے کھولنا تھا۔ اس طرح ہندوستان پر اپنی مصنوعات مسلط کر کے خام مال کو برطانوی تاجروں کے لیے عام کر دیا۔ ان تقاضوں کی بنا پر ہندوستان میں حکومتی انتظامات کو پہلے سے زیادہ موثر بنانے کی کوشش کی گئی۔

تیسرے اور آخری دور میں کمپنی کی جگہ برطانوی حکومت نے سنبھال لی تو ہندوستان کے معاشی نظام پر سرمایہ دارانہ نظام کا غلبہ ہو گیا۔

۱۶۰۱ء میں تجارتی مقاصد کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں تجارتی حقوق دیے گئے۔ مدراس اور سورت میں تجارتی کوٹھیاں تعمیر کی گئیں۔ اس کے بعد جب مغلیہ سلطنت کو زوال ہوا تو ہندوستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا۔ بنگال، اڑیسہ، گجرات اور بہار نے مرکز کو خراج دینا بہت کم کر دیا۔ بعد ازاں ان ریاستوں نے

خود مختاری کا اعلان کر کے مغلیہ حکومت کی شان و شوکت میں کمی کر دی۔ مرکز کے پاس اپنی فوج نہیں تھی بلکہ مرکز جاگیر داروں سے فوج حاصل کرتا تھا۔ جب ریاستیں خود مختار ہوئیں تو انھوں نے مرکز کو فوج اور ٹیکس دینا بھی بند کر دیے جس کی وجہ سے مرکز کی کمزوری کے سبب افراتفری کا عالم پیدا ہو گیا۔

> ان حالات میں منصب داروں اور امرانے اپنی حیثیت اور مراعات کو قائم رکھنے کے لیے اور اپنی جاگیروں سے زبردستی تشدد کے ساتھ ٹیکس وصول کرنے کے لیے اپنی اپنی فوجیں رکھنا شروع کر دیں جو ان کی ذات کے ساتھ وفادار ہوتی تھیں۔ مگر یہ امرا اپنے فوجیوں کو پابندی سے تنخواہ نہیں دیتے تھے اور ان کی آمدن کے ذرائع مال غنیمت اور لوٹ مار ہوا کرتے تھے۔ تنخواہ کے مطالبہ پر ان سے کہا جاتا کہ فلاں شہر اور فلاں گاؤں لوٹ لو۔[۱۲]

برطانیہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہدایت کی کہ وہ مقامی عوام کو فوجی تربیت دے اور اس کے ساتھ انھیں تنخواہ ،رہائش اور دیگر سہولیات میسر کرے اور اس کے لیے وسائل ہندوستان سے پیدا کیے جائیں۔ جب ایسا ہوا تو لوگوں نے حکومت کے بجائے کمپنی کی ملازمت کو اختیار کرنا پسند کیا۔ اس طرح کمپنی کی فوج مقامی ریاستوں کی فوج سے مضبوط ہو گئی۔

بنیادی طور پر جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) کمپنی کے لیے مالیہ وصول کرنے کا سبب بنی۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ میں کمپنی نے خود کو مضبوط کر لیا جس سے انگریز معاشی طور پر مستحکم ہو گئے۔ پلاسی کی لڑائی میں نواب سراج الدولہ کی انگریزوں سے شکست کی وجہ سے کمپنی ایک تجارتی ادارے سے سیاسی قوت میں بدل گئی۔ اب کمپنی نے خود کو تجارت اور سیاست دونوں میں مصروف عمل کر لیا اور ہندوستان کے حکمرانوں سے معاہدے کرنے لگے۔ اس وجہ سے ہندوستان کی سیاست پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

جب سراج الدولہ تخت نشین ہوا تو انگریزوں نے اس کے دربار میں طرح طرح کی سازشیں کرنا شروع کر دیں۔ تاجروں کو خریدا گیا۔ ان کے مال کو بیرون ملک بھیجا گیا۔ سراج الدولہ کے خلاف انگریزوں نے تمام سازشیں کر رکھی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ میر جعفر کو اس بات کی لالچ دی کہ سراج الدولہ کی جگہ تمہیں حکمرانی دی جائے گی۔ میر جعفر جنگ کے موقع پر انگریزوں کے ساتھ شامل ہو گیا اور اس طرح سراج الدولہ کو انگریزوں نے شکست دے دی۔

ہندوستان کے نظام پر کمپنی کا کنٹرول اور اثر و رسوخ بڑھتا جا رہا تھا۔ مختلف ریاستوں میں سازشیں کر کے، لڑائیاں کرنا اور ان سے بھاری رقم وصول کر کے ان کے رسائل پر قابض ہو جانا کمپنی کا معمول کا کام تھا۔ جنگ پلاسی کے بعد بکسر کی لڑائی میں بھی انگریزوں نے کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کے

دروازے کھل گئے۔ انھیں معلوم تھا کہ اب صرف میسور ریاست کے علاوہ کوئی قوت نہیں ہے۔ بنگال اور مدراس کے علاقوں میں انگریزی اثر ورسوخ بڑھ گیا۔ اب ان کے سامنے میسور کی ریاست رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔

> پلاسی کی فتح کے بعد بکسر کی لڑائی ۱۷۶۴ء میں بھی انگریزوں کی فتح نے مغلیہ حکومت یا شمالی ہند کو انگریز کا باج گزار بنادیا۔ اب محض جنوبی ریاست حیدرآباد (نظام) مرہٹے اور میسور کے حکمران حیدر علی ان کی راہ میں رکاوٹیں تھیں، لیکن ان میں سے نظام نے انگریزوں کے ساتھ دوستانہ اور مفاہمانہ مراسم کو ترجیح دینے میں عافیت سمجھی۔ مرہٹے ان ہی دنوں پانی پت میں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں اپنی متحدہ قوت کھو بیٹھے تھے اور جنوب میں سمٹی ہوئی ایک منتشر سی قوت کے طور پر باقی رہ گئے تھے۔ ان دونوں کے مقابلے میں ٹیپو سلطان ایک تازہ اور توانا طاقت کے طور پر ابھر رہا تھا۔[۱۱]

ٹیپو سلطان انگریزوں کی ذہنیت کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انگریزوں کے خلاف جنگ جاری رکھنے کا منصوبہ بنایا۔ ٹیپو کی فوج اور پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوجی قوت سے انگریزوں کو خطرہ لاحق تھا اس لیے انھوں نے ٹیپو کے ساتھ صلح کرنے کا سوچا۔ ٹیپو سلطان فرانسیسیوں کی مدد سے اپنی فوج کو مضبوط کر رہا تھا مگر نظام اور مرہٹوں کے ساتھ مل کر انگریزوں نے ٹیپو سلطان کو شکست دے دی۔

ہندوستان میں مرکز کمزور ہو گیا تھا اور اس طرح سیاسی و معاشی انتشار کا عالم تھا۔ الگ الگ ریاستیں بن گئی تھیں۔ ان میں سے کئی ریاستیں ایسی تھیں جن کے فوجی نظام کو کمپنی نے اپنے ذمے لے لیا تھا اور ریاست اس کے اخراجات ادا کر دیتی تھی۔ کمپنی سب کو آپس میں لڑوانے پر ہر طرح سے کامیاب ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے وہ مقامی حکمرانوں کو آپس میں الجھا کر ان کی طاقت کو کمزور کر دیتی اور پھر خود جا کر اس ریاست پر حملہ آور ہو جاتی اور فتح کر لیتی۔ انگریزوں کو ٹیپو کی فوج کی طرف سے خطرہ لاحق تھا مگر اسے بھی انگریزوں نے فتح کر لیا۔ اس طرح مئی ۱۷۹۹ء میں کمپنی کی راہ میں یہ رکاوٹ بھی اپنے اختتام کو پہنچی۔ ٹیپو کے مرنے کی خبر سن کر لارڈ ولزلی بہت خوش ہوا۔

لارڈ ویلزلی کے دور میں کمپنی کامیابی کے عروج پر تھی مگر پھر بھی ان کا قرض بڑھتا جا رہا تھا۔ کمپنی کے ڈائریکٹر نے حکومت برطانیہ کو لارڈ ویلزلی کی فضول خرچیوں کے بارے میں آگاہ کیا تو لارڈ ویلزلی کو واپس بلا لیا گیا۔ ۱۸۱۳ء میں برطانوی حکومت نے کمپنی کی اجارہ داری کو ختم کرتے ہوئے دیگر برطانوی کمپنیوں کو بھی ہند میں کاروبار کرنے کی اجازت دے دی۔ برطانیہ میں بننے والے کپڑے کو مقبول بنانے کے لیے ہندوستان کی صنعت کو تباہ کیا گیا اور یہاں برطانیہ کی برآمدات سے لاکھوں پاؤنڈ کا منافع کمایا گیا۔

فورٹ ولیم کالج کا قیام:

گورنر جنرل لارڈ ویلزلی جب ہندوستان آیا تو اس نے یہ محسوس کیا کہ ہندوستان جیسے وسیع رقبے پر صرف قبضہ کرنا کافی نہیں بلکہ ہمارے حکمرانوں کا حکومت کرنے کے لیے یہاں کی زبان اور تہذیب و ثقافت سے واقف ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔ اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے ویلزلی نے اورینٹل سیمنری (Oriental Seminary) کی بنیاد ڈالی جس میں سول ملازمین کو اس وقت کی سرکاری زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے نتائج کو مد نظر رکھتے ہوئے ویلزلی نے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ٹیپو سلطان کی موت کی پہلی سال گرہ کے طور پر اس کالج کے قیام کو ایک یادگار بنا دیا جائے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس کا قیام نوجوان انگریزوں کو ہندوستانی زبان و ادب اور علوم و فنون سے روشناس کرانا تھا مگر اس کالج نے ہندوستانی زبان و ادب کا رخ موڑ دیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹر اس حق میں نہیں تھے کہ اس کالج کا قیام ممکن ہو۔ کیوں کہ انھیں لگتا تھا کہ اس سے بہتر نظام ہمارے ہاں لندن میں موجود ہے اور ہندوستان میں انگریزوں کو اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لیے بھیجا جاتا ہے تاکہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے۔ اس وجہ سے فورٹ ولیم کالج کی ابتدا سے ہی انگریزوں کا آپس میں اس بات پر تنازعہ چلتا رہا اور اس کے بعد ہندوستانیوں کے درمیان بھی بڑے تنازع کا باعث بنا۔ یہیں سے اردو اور ہندی تنازع شروع ہوا اور اس حد تک بڑھ گیا کہ ہندوستان بالآخر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

لارڈ ویلزلی نے ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء کو فورٹ ولیم کالج کا افتتاح کیا مگر ویلزلی کے حکم سے قانونی دستاویز پر قیام کی تاریخ ۴ مئی ۱۸۰۰ء ڈالی گئی جو میسور پر برطانوی افواج کی فتح کی پہلی سال گرہ کی تاریخ تھی۔

فورٹ ولیم کالج کے مقاصد کے بارے میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتی کہ اس کے قیام کا مقصد ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود نہیں بلکہ برطانوی فوجیوں اور افسروں کو ہندوستان کی تعلیم دینا تھا تاکہ وہ اس کے ذریعے ہندوستانی عوام سے رابطہ قائم رکھ سکیں اور برطانوی اقتدار کو مستحکم کر سکیں۔ ویلزلی کے پاس دو پہلو تھے ایک تو یہ کہ وہ اچھی تعلیم و تربیت حاصل کریں اور اس کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کے مزاج اور ان کی زبان اور طور طریقوں کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

پہلے زبان سیکھنے کے لیے افسروں کو الاؤنس نہیں دیا جاتا تھا لیکن اس سے کوئی اچھے نتائج سامنے نہ آئے۔ جب ویلزلی ہندوستان آیا تو اس نے یہ محسوس کیا کہ اگر انگریز کو یہاں حکومت کرنی ہے تو سب سے پہلے اس کی زبان سیکھنی ہو گی۔ کمپنی کے ملازمین کے لیے یہاں کی زبان اور ماحول کی آگاہی بہت ضروری ہے۔ اس لیے جب تک کوئی ادارہ نہیں ہو گا، ایسا ممکن نہیں ہو سکتا۔ اس طرح گلکرسٹ جو ہندوستانی زبان پر دسترس رکھتے تھے۔ ملازمین کو روزانہ

درس دینے کے لیے تیار ہوئے۔ ویلزلی نے یہ حکم جاری کیا کہ آئندہ کسی انگریز ملازم کو اس وقت تک بڑے عہدے پر مقرر نہیں کیا جائے گا جب تک وہ یہاں کی زبان کا امتحان پاس نہ کر لے اور اس طرح فورٹ ولیم کالج کا آغاز ہوا۔ فورٹ ولیم کالج سے اردو نثر کو بہت فائدہ حاصل ہوا۔ اس ضمن میں فورٹ ولیم کالج اور اس کا چھاپہ خانہ بہت بڑی خدمت قرار دی جا سکتی ہے۔ ان کے مقاصد سیاسی تھے مگر اس سے اردو زبان کو بہت ترقی حاصل ہوئی۔ بنگال میں اردو میں وفا راشدی لکھتے ہیں کہ:

> فورٹ ولیم کالج کے قیام کا اصل مقصد یہ تھا کہ حکومت کو زبان کے ذریعے امور سیاست اور تنظیم اور ملک گیری میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں پیدا ہو جائیں۔[۱۴]

غرض فورٹ ولیم کالج کا نثری ادب سیاسی مقاصد کی وجہ سے وجود میں آیا مگر اس سے اردو زبان و ادب کو بہت فروغ حاصل ہوا۔

> فورٹ ولیم کالج کے قیام کے محرکات سیاسی تھے لیکن اس کے ثمرات نے بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر ادب کو بھی متاثر کیا اور اردو نثر کی ایک موثر تحریک کو جنم دے دیا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ اردو کا مؤرخ فورٹ ولیم کو ہمیشہ تحسین کی نظر سے دیکھتا ہے۔[۱۵]

فورٹ ولیم کالج میں جب درس و تدریس کا آغاز ہوا تو ہندوؤں کے لیے بھی ہندی تدریس کا آغاز ہوا تاکہ انگریز افسران ان کی زبان سیکھ سکیں۔ اس طرح بیک وقت ایک ہی زبان کو دو مختلف رسم الخط کے ذریعے دو مختلف زبانیں بنا کر اردو ہندی تنازعہ کی بنیاد رکھی گئی۔ نو آبادیات مقامی زبانوں میں پھوٹ ڈال کر اپنی زبان کو ترجیح دیتی ہے۔ اس طرح مقامی باشندوں میں لسانی تعصبات کو جنم دیا جاتا ہے۔ بقول ناصر عباس نیر:

> ہر نو آبادیاتی صورت حال ذولسانیات کو جنم دیتی ہے مگر دونوں زبانیں برابر رتبے کی نہیں ہوتیں، نو آباد کار کی زبان اسی کی مانند مہذب اور افضل ہوتی ہے، جب کہ نو آبادیاتی اقوام کی زبانیں، گنوار لوگوں کی زبانیں ناشائستہ ہوتی ہیں۔ زبان کا اقداری درجہ اس کے بولنے والوں کی نسبت سے متعین ہونے لگتا ہے بلکہ یہ کہنا بجا ہو گا کہ زبان ایک آلہ اظہار کے بجائے "علامت رتبہ" بن جاتی ہے۔[۱۶]

فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی زبان کے شعبہ کا صدر جان گلکرسٹ کو مقرر کیا گیا۔ جنھوں نے بلا مبالغہ اردو نثر کے لیے راہ ہموار کی۔ وہ تقریباً چار سال تک فورٹ ولیم کالج کا صدر رہا جس میں شعبہ ہندوستان زبان کو بہت ترقی حاصل ہوئی۔ انھوں نے اردو قواعد پر لغت لکھی۔ ان کی تصانیف درج ذیل ہیں۔

۱۔ انگریزی ہندوستانی ڈکشنری

۲۔ ہندوستانی گرامر

۳۔ اورینٹل لینگوسٹ

۴۔ قصص مشرقی

۵۔ رہنمائے زبان اردو

اس کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میر بہادر علی حسینی، شیر علی افسوس، کاظم علی جوان، میر امن، مظہر علی خاں ولا، حیدر بخش حیدری، خلیل خاں اشک وغیرہ نے اردو نثر میں اپنی خدمات سرانجام دیں۔

انگریزوں نے ہندوستان کے سماجی استحصال کے لیے ان کی اپنی زبان و ثقافت سے بیزاری پیدا کی اور یہ نو آبادیات کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد ہے کہ وہاں کے باشندوں کو یہ احساس دلانا کہ ان کے زوال کا سبب خود ان کی زبان و ثقافت ہے۔

نو آبادیاتی کلچر اور تعلیم کی وجہ سے ہندوستان میں دو گروہ بن گئے جن میں سے ایک قدیم روایات اور کلچر کو فوقیت دیتے تھے اور دوسرے جدید تعلیم حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔ وہ اپنی روایات، ثقافت اور علوم کو فرسودہ سمجھنے لگے تھے۔ اس طرح آپس میں انتشار پھیل رہا تھا اور یہ انگریزوں کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے فائدہ مند ثابت ہو رہا تھا۔

بطور فاتح انگریزوں نے ہندوستانی عوام کے ذہن میں یہ سوال پیدا کر دیا کہ وہ تہذیبی و معاشی طور پر کمزور قوم ہے اور ہم مہذب قوم ہیں۔ ہندوستانیوں کو اس بات پر خدا کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ہم ان کے حکمران ہیں۔ خدا نے ہمیں ان کا حکمران بنا کر بھیجا ہے تاکہ ان کی حالت کو بہتر کیا جاسے۔ اس طرح انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی جڑیں مضبوط کر لیں اور ہندوستان کے ترقیاتی منصوبوں کی طرف توجہ دینے لگ گئے۔ ذرائع آمدورفت کے وسائل کو بہتر بنانے کی کوشش کی، ریل لائن بچھائی گئی۔ بظاہر تو یہ ہندوستانیوں پہ احسان تھا مگر پس پشت اس سے وہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر رہے تھے۔ ریل لائن بچھانے سے خام مال تیزی سے برطانیہ منتقل کیا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے خام مال کو برطانیہ پہنچتے پہنچتے مہینے لگ جاتے تھے جن سے ان کے کارخانے بند ہو جاتے تھے۔ اس بارے میں ڈاکٹر خواجہ زکریا کہتے ہیں کہ:

> یہ سچ ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں نے سڑکیں بنائیں، ریل کی پٹریاں بچھائیں، تار برقی کا سلسلہ جاری کیا وغیرہ، مگر ان سب "برکات" کے اصل مقاصد کچھ اور تھے۔ ضمناً لوگوں کو کچھ سہولتیں بھی میسر آ گئیں۔ درحقیقت یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ ہندوستان کے طویل و عرض سے خام مال تیز رفتاری سے بندرگاہوں تک منتقل کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ بغاوت کی صورت

میں یا جنگ کے زمانے میں افواج اور اسلحے کی نقل و حمل اور رابطے میں آسانی ہو۔ اگر یہ سب عوام کے فائدے کے لیے ہوتا تو سڑکوں اور ریلوں کے اس وسیع نظام کے باوجود قحطوں سے اتنے لوگ نہ مرتے۔[۱۷]

بنیادی طور پر ہندوستان سے خام مال پیدا کر کے اسے کم سے کم وقت میں اپنے ملک میں بھیجا جاتا تھا اور وہاں سے تیاری کے بعد وہی مال ہندوستان اور دنیا کے دوسرے ممالک میں جاتا تھا۔ ہندوستان کی مقامی صنعت کو تباہ کر دیا گیا تھا تاکہ برطانوی صنعت کو ترقی حاصل ہو سکے۔

ایسا تعلیمی نظام نافذ کیا گیا جس میں لوگوں کو نام نہاد مہذب بنا کر انگریزوں کی نگرانی کے لیے تربیت یافتہ بنایا جائے۔ نو آبادیاتی عہد میں ہندوستان میں ایسے ادارے بنائے گئے جو ہندوستانی عوام کو ایسی تعلیم دیتے تھے کہ وہ لوگ انگریزوں کے خلاف آواز نہ اٹھائیں بلکہ انگریزوں کی حمایت کریں اور اس پر شکر ادا کریں کہ انگریز ہمارے حاکم ہیں۔ جو لوگ ان کی مخالفت کرتے تھے انھیں ناشکرا کہا جاتا تھا۔ انگریز ہندوستانیوں کو یہ احساس دلانا چاہتے تھے کہ انھیں جاہلیت سے نکال کر ہم ایک مہذب قوم بنا رہے تھے۔ پس ماندگی سے نکال کر خوش حالی کی راہ پہ لے کے جا رہے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی:

جنگ آزادی ہند کا آغاز ۱۸۵۷ء میں بنگال میں ہوا۔ ۱۸۵۷ء میں پہلی مرتبہ غیر ملکی حکمرانوں کو اپنی سرزمین سے باہر نکالنے کا فیصلہ کیا گیا اور ایک عملی قدم اٹھایا گیا۔ اس جنگ میں لڑنے کے لیے پورا ہندوستان ایک ہو گیا۔ ان میں کسی قسم کی ہندو مسلم کی تفریق نظر نہیں آئی۔ سب نے اس جنگ میں حصہ لیا۔ یہ جنگ ایک بہت بڑے مقصد کے تحت لڑی گئی تھی لیکن نصب العین ایک ہی تھا۔ وہاں کوئی بھی اپنے ذاتی مفاد کے لیے نہیں لڑ رہا تھا۔ وہ سب کے سب اجتماعی مقاصد کے لیے لڑ رہے تھے۔ ان کے پیشِ نظر عوام کی بہتری تھی، اپنے ملک کو بچانے کے لیے وہ یہ جنگ لڑ رہے تھے۔ انہی مقاصد کے تحت انھوں نے منصوبے بنائے جو کہ جنگِ آزادی کی شکل میں رونما ہوئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء میں جو کچھ ہوا اس میں کوئی تنظیم نہیں تھی۔ اس میں نظم و ضبط نہیں تھا۔ اس میں ایک طوفان تھا، ایک آندھی تھی جو ساری فضا پر چھا گئی۔ کیوں کہ وہ ایک انقلابی جنگ تھی جو کئی اسباب کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی مگر اس جنگ نے ہندوستان کے لوگوں میں آزادی کی جدوجہد جگا دی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بظاہر تو ہندوستانی ناکام رہے مگر اس ناکامی نے ان کے دلوں میں ولولہ پیدا کر دیا تھا اور اس کے بعد بھی وہ چین سے نہ بیٹھے۔ تین چوتھائی صدی گزر گئی، لڑائی جاری رہی مگر اس کی صورتیں بدلتی رہیں، بالآخر ہندوستانیوں نے انگریزوں کو اپنی سرزمین سے باہر نکال کر دم لیا۔

ہندوستان تاجر کی حیثیت سے ہندوستان آئے تھے اور وہ یہاں حکومت کرنے لگ گئے اور اس ہوس کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے بہت سے ظلم ڈھائے چنانچہ بنگال میں سراج الدولہ کے ساتھ، میسور میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے ساتھ، دلی میں شاہ عالم کے ساتھ اور اودھ میں جان عالم واجد علی شاہ کے ساتھ انھوں نے جو کچھ کیا، اس کی مثالیں دنیا میں بہت کم ملتی ہیں۔ ہندوستانی عوام ان سب باتوں کو بہت اچھی طرح سے بھانپ رہی تھی ۔ ان واقعات کے باعث ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والی نفرت پیدا ہو گئی اور وہ انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے ۔ وہ صرف مناسب وقت کا انتظار کر رہے تھے اور یہ مناسب وقت انھیں ۱۸۵۷ء کا وہ دن لگا جب ہندوستانی فوجوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت شروع کر دی۔ انگریز اسے غدر کا نام اور اسے مذہبی رنگ دیتے ہیں کہ ہندوستانی فوجوں نے صرف کارتوسوں کی وجہ سے بغاوت شروع کر دی کہ جن کو ہندو گائے کی چربی سمجھ کر اور مسلمان سور کی چربی سمجھ کر استعمال نہیں کرنا چاہتے تھے تو وہ بغاوت پر اتر آئے مگر بغاوتیں اتنی چھوٹی باتوں پر نہیں کی جاتیں۔ ہندوستانی فوج نے بغاوت اس لیے کی کہ وہ اپنی سرزمین پر انگریزوں کی حکومت نہیں چاہتے تھے۔ انگریزوں نے ہندوستانی حاکموں کے ساتھ بہت برے سلوک کیے۔ ہندوستانی عوام کو غلام بنا کر رکھا، ان سب وجوہات کی بنا پر جنگِ آزادی کی شروعات ہوئی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں صرف ہندوستانی فوج کے سپاہی شریک نہیں تھے بلکہ اس میں عوام بھی شامل تھی۔ امرا اور رؤسا شریک تھے، سب کے پاس اسلحہ نہیں تھا مگر جس کے ہاتھ جو ہتھیار آیا اس نے اسی کو استعمال کیا۔ لکھنؤ میں لوگ گھروں سے چمٹے اور جلی ہوئی لکڑیاں تک اٹھالائے اور شہر میں جگہ جگہ جمع ہونے لگے۔

> ۱۸۵۷ء کے اس ہنگامے کی ذمہ داری پوری طرح انگریزوں پر عائد ہوتی ہے۔ ہندوستان انگریزوں کا ملک نہیں تھا۔ یہاں ان کی حیثیت محض تاجروں کی تھی لیکن جب انھوں نے ہندوستان کے حکمرانوں کی نااتفاقیوں سے فائدہ اٹھا کر بہت سے علاقے پر قبضہ کر لیا اور حکمرانوں کی حیثیت اختیار کر لی، تب بھی وہ اپنے آپ کو غیر ملکی بالاتر قوم سمجھتے رہے۔ ان سے پہلے بھی بہت سے حملہ آور ہندوستان آئے تھے لیکن ہندوستان کو فتح کرنے کے بعد وہ یہاں پر ہی بس گئے تھے اور اسی سرزمین کو اپنا وطن سمجھنے لگے۔ اس کے برخلاف انگریز لوگ نسل، رنگت، تہذیب و تمدن، تعلیم وغیرہ کے اعتبار سے اپنے آپ کو ایشیائی لوگوں سے برتر سمجھتے تھے۔ [۱۸]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے پس پشت بہت سے اسباب تھے جن کی وجہ سے ہندوستانیوں نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ وہ اسباب درج ذیل ہیں۔

۱۔ عیسائی مشنری دوسرے مذاہب کی توہین کرتے تھے اور اپنے مذہب کی تشہیر کرتے تھے۔ اس کام کے لیے انگریز حکومت ان کا بھرپور ساتھ دیتی تھی کیوں کہ حکومت چاہتی تھی کہ ہندوستان میں عیسائیت عام ہو جائے، ایسا ہونے سے ان کے لیے بہت سی مشکلات آسان ہو جائیں گی۔

۲۔ کسی سرکاری ادارے کے قیام کے لیے مندر یا مسجد کو گرا دینا انگریز حکومت کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

۳۔ فوجی اصطلاحات داڑھی منڈوانا پگڑی کے بجائے ٹوپی وغیرہ جیسی اصطلاحات معاشرے میں بے چینی کا باعث بن رہی تھیں۔

۴۔ ہندوستان میں معاشی استحصال کیا جا رہا تھا۔ انگریز تاجر صرف اپنے ملک کے بارے میں سوچتے تھے اور سارے کا سارا مال اپنے ملک بھیجتے تھے۔ ہندوستان معاشی طور پر تباہ ہو رہا تھا مگر انھیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔

سر سید احمد خان نے بھی اسباب بغاوت ہند میں ایسے نکات کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ حکومتی اقدامات کی غلط تفہیم۔

۲۔ ایسے قوانین کا اجرا جو مقامی اقدار سے مطابقت نہ رکھتے ہوں۔

۳۔ حکومت کی رعایا کے احوال سے عدم واقفیت۔

۴۔ ہندوستانی معاشرے کی اہم ضرریات کا حکومت کی طرف سے نظر انداز کیا جانا۔

۵۔ فوج کی بد انتظامی۔[۱۹]

ہندوستانی عوام نے اس جنگ کو شروع کیا مگر وہ اس میں فتح نہ پا سکے۔ انگریزوں نے سیاست کھیل کر اور مقامی حکمران جو انگریزوں کے ساتھ تھے ان کے ساتھ مل کر اس پر قابو پا لیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ لوگوں کو بے دردی سے قتل کرنا شروع کر دیا، سینکڑوں لوگوں کو سرِ عام پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ لوگوں کو گولیوں سے اڑا دیا گیا۔ انھوں نے بے جا قتل کیے، کسی مجرم یا بے گناہ کو نہیں دیکھا بس قتل عام کرتے رہے۔ لیکن جلد ہی انگریزوں کے ساتھ ہندو مل گئے اور ان کے ساتھ ہو گئے اور قتل کرتے رہے۔ اس طرح چن چن کر مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ جنگِ آزادی کا سارا الزام مسلمانوں پر آ گیا۔ اگست ۱۸۵۸ء میں برطانوی پارلیمان نے اعلان کیا کہ ایسٹ انڈیا کا خاتمہ کر کے ہندوستان پر اب تاج برطانیہ کی حکومت ہو گی۔ اب ہندوستان باقاعدہ طور پر برطانوی قوم کی نو آبادی بن چکا تھا۔ مسلمان معاشی طور پر کمزور اور ہندو انگریزوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ جس سے مسلمانوں کو بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور باقاعدہ طور پر ہندوستان اب انگریزوں کی غلامی میں آ گیا۔ اس

کے بعد انگریزوں نے اپنی حکومت قائم کی، نئے قوانین بنائے اور ہندوستانیوں کی معاشی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ نوآبادیاتی استحصال کی وجہ سے کسان بغاوتوں نے جنم لیا جن میں تیتو میر اور دودھو میاں کی بغاوتیں شامل ہیں۔ مسلمانوں میں احساس محرومی بڑھ گیا۔ کل کے حاکم آج کے سپاہی بن گئے تھے، وہ بھی ایک غیر ملکی طاقت کے ہاتھوں۔ ہندوستان کے پرانے قوانین جو مغلیہ سلطنت میں بنائے گئے تھے ان سب کو ختم کر کے نئے قوانین بنائے گئے اور پورے ہندوستان پر قابض ہو گئے۔

اب تک ہم نے نوآبادیات کے نظریات کے متعلق جتنی بھی بحث کی ہے اسے البرٹ میمی کے نظریات کی روشنی میں دیکھیں گے اور اسی کے مطابق ایک باقاعدہ فریم ورک مرتب کریں گے، اسی فریم ورک کے تناظر میں "نولکھی کوٹھی" کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

فریم ورک البرٹ میمی(Albert Memmi):

البرٹ میمی دسمبر ۱۹۲۰ء کو تیونس میں پیدا ہوا۔ البرٹ میمی نے فرانسیسی پرائمری سکول سے تعلیم حاصل کی اور تیونس کے کانونٹ ہائی سکول، الجزائر کی یونی ورسٹی سے اس نے فلسفہ پڑھا۔ البرٹ میمی نے خود کو تین ثقافتوں کے سنگم پر پایا اور اپنے کام کی بنیاد مشرق اور مغرب کے درمیان توازن تلاش کرنے پر رکھی۔ ۱۸۸۱ء میں تیونس فرانسیسیوں کی کالونی بن گیا اور ۱۹۵۶ء میں فرانس سے آزادی حاصل ہوئی۔ نوآبادیاتی دور میں تیونس فرانسیسی نوآبادکاروں، اطالویوں، تیونسی مسلمانوں اور یہودیوں کی اقلیت کا گھر تھا۔ اگرچہ البرٹ میمی نے تیونس میں آزادی کی تحریک کی حمایت کی۔ اگرچہ اس نے تیونس میں آزادی کی تحریک کی حمایت کی لیکن وہ اپنی فرانسیسی تعلیم اور اپنے یہودی عقیدے کی وجہ سے نئی مسلم ریاست میں جگہ نہیں پا سکے اور آزادی کے بعد انھیں نئی ریاست کو چھوڑنے کے لیے کہا گیا۔ ان کا انتقال مئی ۲۰۲۰ء میں فرانس میں ہوا۔

البرٹ میمی کا پہلا معروف ناول *The Pillar of Salt La Statue de Sel* کے طور پر ترجمہ کیا گیا۔ ۱۹۵۳ء میں البرٹ کاموس کے دیباچے کے ساتھ شائع ہوا اور اسے ۱۹۵۴ء میں Feneon کے انعام سے نوازا گیا۔ ان کے دیگر ناولوں میں آگر (جس کا ترجمہ "اجنبی" کے نام سے کیا گیا) لی اسکارپین اور لی ڈیزرٹ شامل ہیں۔

ان کا سب سے مشہور نان فکشن کام The Colonizer and the Colonized ہے جو دو گروہوں کے باہمی تعلق کے بارے میں ہے۔ یہ ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔ البرٹ میمی کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے اسکالر جوڈتھ رومانی نے زور دیا کہ تیونس کے مصنف کا کام "وقت کے ساتھ ساتھ اسی فلسفیانہ ارتقا کو اس کے اصل نقطۂ نظر

سے کم بنیاد پرست لیکن شاید زیادہ حقیقت پسندانہ پوزیشنوں پر ظاہر کرتا ہے۔" [۲۰] وہ یہ نتیجہ اخذ کرتی ہے کہ "اس کا تازہ ترین افسانہ یقیناً اس کے پہلے کام سے زیادہ اختراعی اور مختلف ہے۔" [۲۱]

نو آبادیات اور البرٹ میمی کے نظریات:

نو آبادیاتی باشندوں کا نو آبادکاروں کی طرح بننے کی کوشش کرنا:

نو آبادیاتی نظام میں جن لوگوں کو بھرتی کیا جاتا ہے جیسا کہ کسی تنظیم کو چلانے کے لیے لوگوں کو بھرتی کیا جائے یا پولیس، فوج وغیرہ کے نمائندے نو آبادیات کا ایک زمرہ بناتے ہیں جو اپنی سیاسی و سماجی حالت سے فرار ہونے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ایسا کرتے ہوئے، کالونائزرز کے مفادات کے تحفظ کے لیے اپنے آپ کو کالونائزرز کی خدمت میں شامل کرنے کا انتخاب کرتے ہیں۔ وہ کالونائزرز کو اپناتے ہیں، ان کے رسم و رواج اور ان کے رہن سہن کو اپنی زندگی میں شامل کرتے ہیں اور یہ سب صرف کالونائزرز کے دل میں اپنی جگہ بنانے کے لیے کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنی اقدار اور اپنی زندگی کے حوالے سے بھی وہ چاہتے ہیں کہ وہی عناصر شامل ہوں جو کالونائزرز کی زندگی میں ہیں۔ ان کی مراعات سے مسلسل متاثر ہو کر وہ ان کا مزہ لیتے ہیں۔ وہ کالونائزرز کے نظریات کو اپناتے ہیں۔ وہ نو آبادیات کو قانونی حیثیت دیتے ہیں جس طرح بہت سے لوگ اپنے ناقص تعلقات کو ظاہر کرنے سے گریز کرتے ہیں، اسی طرح نو آبادیاتی باشندہ اپنے ماضی اور اپنی روایات کو چھپاتا ہے کیوں کہ اس کی تمام اصلیتیں بدنام ہو چکی ہوتی ہیں۔ امتزاج کا امیدوار ہمیشہ اپنی حد سے زیادہ قیمت سے تنگ آجاتا ہے جو وہ صرف ادا کرتا ہے اور جس کا واجب الادا کبھی ختم نہیں ہوتا۔ وہ خطرے کی گھنٹی کے ساتھ اپنی کوشش کا پورا مطلب دریافت کرتا ہے۔ یہ ایک ڈرامائی لمحہ ہے کہ جب اسے احساس ہوتا ہے کہ کالونائزرز کے تمام الزامات اور مذمتیں جو انھوں نے مقامی باشندوں پہ لگائی تھیں، انھیں وہ حقیقت تسلیم کر لیتا ہے اور مقامی باشندوں کو نو آبادکار کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے مگر اس کے بعد اسے یہ احساس تب ہوتا ہے جب وہ خود کو نو آبادکار کی طرح ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے لوگوں کے خلاف جا کر نو آبادکار کی حمایت کرتا ہے مگر یہ ہی نو آبادکار اسے کبھی بھی وہ درجہ نہیں دیتا جو انھوں نے اپنا مقام رکھا ہوتا ہے۔ تب اسے احساس ہوتا ہے کہ اپنی روایات سے بھی گیا اور جن کے لیے خود کو تبدیل کیا۔ خود کو انہی کے طرزِ عمل میں ڈھال دیا مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ مجھے بھی اسی سطح پر رکھا گیا جس سطح پر تمام مقامی باشندے ہیں تو میری یہ تمام محنتیں رائیگاں گئیں۔

نو آبادیاتی باشندوں کا نو آباد کار سے اظہار نفرت کرتے ہوئے اعلان بغاوت کرنا:

نو آبادیاتی حالات میں مقامی باشندے نو آبادیات کے خلاف بغاوت تو کر سکتے ہیں مگر اسے کبھی رد نہیں کر سکتے۔ وہ اس سے انکار کرتے ہیں اور اپنے نظریے کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر یہ کوشش رائیگاں جاتی ہے۔ انھیں اسی نو آبادیاتی نظام میں زندگی بسر کرنی ہوتی ہے۔ یہ حقائق نو آبادیاتی نظام کا اصل جوہر بنتے ہیں اور جلد ہی استعمار کو اپنے ابہام کا احساس ہو جاتا ہے۔ کالونائزرز کی حقیقت کو قبول کرنے کا مطلب ہے کہ کسی کے غاصب ہو جانے پر راضی ہو جانا۔

نو آبادیات کے حالات سے نکلنے کا واحد راستہ ہی بغاوت ہے۔ نو آبادیاتی صورت حال اپنی اندرونی ناگزیریت سے بغاوت کو جنم دیتی ہے۔ نو آبادیاتی نظام کے لیے خود کو ایڈجسٹ نہیں کیا جاسکتا بلکہ لوہے کے گریبان کی طرح اس کو توڑا جاسکتا ہے۔ نو آبادیاتی حالات سے بغاوت نہ کرنا ہی جبر کو جنم دیتا ہے۔ نو آبادیات کا مکمل خاتمہ ہی بغاوت کرنے سے ہو گا۔ رہنے کے لیے نو آبادیاتی نظام کو ختم کرنا ہو گا۔ ایک آدمی بننے کے لیے، اسے اس نو آبادیاتی وجود کو ختم کرنا ہو گا، جو بن چکا ہے۔ نو آبادیات کے خاتمے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے نو آبادیاتی باشندوں کو اپنی خامیوں کی طرف دیکھنا ہے، انھیں دور کرنا ہے۔ جبر کے خلاف مزاحمت کرنی ہے اور مسلسل محنت کرنے سے خود کو اس نو آبادیاتی نظام سے آزاد کر لینا ہے۔ اسے خود کو فتح کرنا چاہیے اور قوم کے سلسلے میں نو آبادیاتی نظام اداروں کو تباہ کر دیتا ہے، تعلقات کو بگاڑتا ہے۔ اس کے خلاف بغاوت کریں گے تو خود محفوظ رہیں گے۔ کسی ٹھوس صورت حال سے ذہنی طور پر بچنا، اپنے حقیقی رشتوں کے ساتھ رہتے ہوئے اس کے نظریے سے انکار کرنا ایک مشکل امر ہے۔ اس سے وہ زندگی تضاد کے نشان کے تحت گزارتا ہے جو ہر قدم پر اسے ہر طرح سے ہم آہنگی اور سکون سے محروم کر دیتا ہے۔

نو آبادیاتی باشندوں کا اپنی اور نو آباد کار کی تہذیب اور علوم کو ایک ساتھ لے کر چلنا:

نو آباد کار نو آبادیاتی باشندوں کی تہذیب اور علوم و فنون سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے مگر نو آبادیاتی باشندے اپنی اور نو آباد کار کی تہذیب کو ایک ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ یہ واضح ہے کہ جو لوگ نو آبادیات کی مخالفت کرتے ہیں، اس کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ انھیں پھر بھی اسی خطے میں رہنا پڑتا ہے بلکہ پہلے سے زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان میں کچھ ایسے باشندے ہوتے ہیں جو نو آباد کار اور اپنی تہذب اور علوم کو ایک ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ وہ اپنی روایات کو بھی نہیں چھوڑتے اور نو آباد کار کی تہذیب کو بھی اپناتے ہیں۔ کسی ٹھوس صورت حال سے ذہنی طور پر بچنا، اپنے حقیقی رشتوں کے ساتھ رہتے ہوئے نو آباد کار کی تہذیب کو اپناتا ہے۔ نو آبادیاتی باشندے اگر نو آبادیات کی

مخالفت بھی کریں تو اسے ترک نہیں کر سکتے۔ انھیں اس اذیت سے گزرنا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اسی نقطے کو مناسب سمجھتے ہیں کہ اپنی روایات اور تہذیب کو بھی ساتھ لے کر چلنا ہے۔ ایک گروہ ہے جو اپنی تہذیب اور روایات کو ترک کر دیتا ہے اور نو آبادکار کی خوش نودی کے لیے ان کی تہذیب کو اپنالیتا ہے مگر آخر کار نو آباد اسے پھر بھی اپنے ساتھ شامل نہیں کرتے تب وہ نہ تو نو آبادکار کے زیر سایہ رہ سکتا ہے اور نہ ہی اپنی روایات کو منھ دکھانے کے قابل رہتا ہے۔ وہ بالآخر جہاں سے چلتا ہے وہیں آکر رک جاتا ہے۔ اس گروہ کے باشندوں کو نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں مگر جو باشندے اپنی اور نو آبادکار کی تہذیب ایک ساتھ لے کر چلتے ہیں، انھیں زیادہ نقصانات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ کیوں کہ وہ اپنی روایات، اپنے علوم وفنون کو بھی ساتھ لے کر چل رہے ہوتے ہیں اور جو علوم وفنون ان پر مسلط کر دیے جاتے ہیں انھیں بھی حاصل کر رہے ہوتے ہیں۔

ادب میں نو آبادکار اور نو آبادیاتی باشندوں کی تصویر کشی الگ الگ انداز میں کرنا:

نو آبادیات کے اندر لسانی کشمکش میں مادری زبان کو کچل دیا جاتا ہے۔ نو آبادیاتی باشندہ خود ہی اپنی زبان کو اجنبیوں کی طرح دیکھنے لگتا ہے اور اسے ترک کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ نو آبادکار کی زبان کو زیادہ اہمیت دینے لگتا ہے۔ سکولوں میں بچوں کو جو تعلیم دی جاتی ہے، جو یادداشت انھیں سونپی جاتی ہے وہ ان کی اپنی نہیں ہوتی، جو تاریخ انھیں پڑھائی جاتی ہیں وہ اسی دنیا کی عکاسی کرتی ہیں جو انھیں کسی طرح بھی اپنی یاد نہیں دلاتی۔ استاد اور سکول ایک ایسی دنیا کی نمائندگی کرتے ہیں جو ان کے خاندانی ماحول سے بالکل مختلف ہے۔

مادری زبان کو سماجی زندگی پر کچھ اثر انداز ہونے کی اجازت نہ دی گئی۔ کہیں بھی سرکاری دفاتر کے کاؤنٹر زپر استعمال نہ کی جاتی۔ پوری بیوروکریسی، پورا عدالتی نظام اور تمام انڈسٹری کالونائزرز کی زبان سنتی اور استعمال کرتی ہے۔ اسی طرح ہائی وے کے نشانات، ریلوے اسٹیشن کے نشانات، سڑکوں کے نشانات اور رسیدیں نو آبادیوں کو اپنے ملک میں غیر ملکی کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔ مزید بر آں نو آبادیات کی مادری زبان جو اس کے احساسات، جذبات اور خوابوں سے قائم رہتی ہے، جس میں اس کی نرمی اور حیرت کا اظہار ہوتا ہے۔ ملک میں یالوگوں میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

ایک گروہ کا سب سے ضروری دعویٰ جو کہ زندہ ہو رہا ہے، اپنی زبان کی آزادی اور بحالی ہے۔ صرف وہی زبان نو آبادیات کو اپنے وقت کے روکے ہوئے بہاؤ سے دوبارہ رابطہ قائم کرنے اور اپنے کھوئے ہوئے تسلسل اور اپنی تاریخ کو تلاش کرنے میں مدد دے گی۔

نو آبادیاتی صورت حال میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں کیا ہوا ہے۔ محکوم اور استحصال کرنے کے لیے نو آبادیاتی باشندوں کو تاریخی اور سماجی، ثقافتی اور تکنیکی دھارے سے باہر دھکیل دیا۔ نو آبادیاتی باشندوں کے لیے

ان کی اپنی زبان کی اہمیت کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ انھیں سکولوں میں بھی کالونائزرز کی دی گئی تعلیم ہی ملتی ہے اور جو اصل روایات اور تاریخ ہوتی ہے اس کے بالکل برعکس سکھایا جاتا ہے۔ مختصراً ہر طریقے سے کالونائزرز کی زبان کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اس طرح سے بھی نو آبادیاتی باشندوں کو احساس کمتری کا شکار بنایا جاتا ہے اور انھیں ان کی اپنی نظروں میں ہی گرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

نو آبادیاتی باشندوں کو یہ جھانسا دیا جاتا ہے کہ ان کی زبان کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے اور انھیں تحفظ چاہیے،

اس سے ایک محافظ کا تصور آ جاتا ہے۔ نو آبادیات میں ہے کہ نو آبادیاتی باشندوں کو انتظامی کاموں سے خارج کر دیا جائے اور کہا جائے کہ یہ بھاری ذمہ داریاں ہم خود سنبھال لیں گے۔

حصہ ب: منتخب اردو ناولوں میں نو آبادیات کے اثرات

ناول انسانی زندگی کا بھرپور مطالعہ ہے۔ یہ زندگی کے اہم واقعات کا بیان نہیں بلکہ حقیقت کی ایسی سچی تصویر ہے جس میں ناول نگار کے تجربے اور خواب ہم آہنگ ہو کر قوس قزح کا منظر پیش کرتے ہیں۔ ناظر جب اس تصویر کو دیکھتا ہے تو کچھ دیر کے لیے اس کے پس منظر میں کھو جاتا ہے۔ پھر کچھ مسائل کبھی تارے، کبھی چاند اور کبھی سورج بن کر، اس کے سامنے ابھرتے ہیں جن سے زندگی کی سچائی، تلخی، نشاط اور کرب کی کرنیں ابھرتی نظر آتی ہیں۔" اس طرح ناول زندگی کی تصویر ہی نہیں بلکہ ہمہ رنگ تعبیر بھی ہے۔"[۱۱]

ناول ہمارے ہاں انگریزی کے اثر سے آیا۔ ہمارے ہوں جو اصناف ہیں ان میں شاید سب سے زیادہ اہمیت ناول کو حاصل ہے۔ کیوں کہ یہ حقیقت کے زیادہ قریب ہوتا ہے اور پڑھنے والا اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس میں زندگی کا عکس موجود ہوتا ہے۔ زندگی کی ہر تبدیلی، ہر رنگ کی جھلک ناول میں دکھائی دیتی ہے۔ ناول نگار اپنے ناول میں ایک دنیا آباد رکھتا ہے۔ جیسے زندگی میں انسان بستے ہیں اسی طرح ہمیں ناول میں بھی کردار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انھیں حقیقی انسانوں جیسا پیش کیا جاتا ہے۔ ناول کے درج ذیل عناصر ہیں۔

کہی یا سنی ہوئی بات چاہے وہ فرضی ہو یا حقیقی اسے قصہ یا کہانی کہا جاتا ہے۔ ناول کے قصے حقیقی زندگی کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ ناول میں انسانی حرکات و سکنات اور واقعات کا بیان اس طرح ہوتا ہے کہ ہر کہانی میں شروع کا قصہ ہوتا ہے پھر درمیان کا قصہ اور آخر یہ کوئی نتیجہ خیز قصہ ہوتا ہے۔ ابتدا، درمیان اور آخر کے قصے میں وقت اور صورت حال کی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں اور اس میں وقت کے حوالے سے ترتیب ایک ضروری امر ہے۔

عام طور پر ناول میں قصے اور پلاٹ میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا مگر ان دونوں میں فرق ہے۔ کیوں کہ یہ ممکن ہے کہ ناول میں پلاٹ نہ ہو اور قصے موجود ہوں۔ ناول کا پلاٹ قصوں کی ترتیب سے تعلق رکھتا ہے۔ پلاٹ میں بھی واقعات کو بیان کیا جاتا ہے مگر واقعات کو سبب اور مسبب کے مطابق ترتیب میں لایا جاتا ہے۔ پلاٹ سے مراد واقعات کا وہ خاکہ ہے جو ناول نگار شروع سے پیش رکھتا ہے اور اسی ترتیب سے واقعات کو بیان کرتا ہے۔

ناول میں زندگی کا نقشہ موجود ہونا چاہیے اور جتنا جیتا جاگتا نقشہ ہوگا ناول کو اسی قدر مقبولیت حاصل ہوگی۔ اسی لیے ناول نگار کو چاہیے کہ وہ ناول میں ایسے کرداروں کو پیش کرے جن سے اسے مکمل واقفیت حاصل ہو۔ صرف قصہ گوئی کے لیے کرداروں کو پیش نہ کرے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ ضروری ہے کہ کردار جیتے جاگتے ہوں، پڑھنے والا انھیں ایسے سمجھے جیسے اس کے آس پاس کے لوگ رہتے ہیں یعنی وہ قاری کے لیے مافوق الفطری نہ ہوں تاکہ قاری انھیں سمجھ سکے اور اپنی سماجی زندگی سے اس کردار کو ہم آہنگ کر کے دل چسپی لے۔

ناول نگار کردار کا تعارف اس طرح نہیں کرواتا کہ وہ اس کے بارے میں سب کچھ لکھ دیتا ہے بلکہ اس کے مختلف پہلو آہستہ آہستہ ہمارے سامنے لاتا رہتا ہے کہ ناول کے ختم ہونے تک ہمیں کرداروں کے بارے میں کچھ نہ کچھ پہلو ملتا رہتا ہے۔ کرداروں کی بہت سی اقسام ہیں جن میں مرکزی کردار، ثانوی کردار، ذیلی کردار، مضحک کردار، مرکب کردار، محدود کردار، مجہول کردار، اُکھرے کردار، ادھورے کردار، سپاٹ کردار، پیچیدہ کردار، مکمل کردار، غالب کردار، عاجز کردار، خاکسار کردار، مکار کردار اور حساس کردار وغیرہ شامل ہیں۔

ناول نگاری میں ماحول ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ناول میں ماحول سے مراد یہ ہے کہ اس میں قصہ کس خاص زمانہ و ماحول یا اخلاق و رسوم سے تعلق رکھتا ہے؟ اکثر ناول نگار کسی شہر کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتا ہے، کوئی کسی طبقہ کی، کوئی کسی دیہات کی اور کوئی سیاسی زندگی وغیرہ کی عکس کشی کو اپنا دائرہ بنالیتا ہے۔

ناول نگار اپنے ماحول کو دو طرح سے ناول میں پیش کرتا ہے۔ اول یہ کہ وہ سماج کے نقشے جس میں سڑکیں، بازار اور گلیاں وغیرہ شامل ہیں۔ دوم وہ قدرتی مناظر کو پیش کرتا ہے جن میں جنگلات، پہاڑوں یا دریاؤں کی تصویر کشی کرتا ہے۔

مکالمہ ناول کا ایک اہم جزو ہے جو اسے ڈرامے کے اجزا سے ورثہ میں ملا ہے۔ مکالمے کے ذریعے کرداروں کی خصوصیات کو دل چسپ طریقے سے پیش کیا جاتا ہے۔ مکالمہ کے ذریعے کرداروں کے احساسات اور جذبات وغیرہ کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ کرداروں کی فطرت کا اندازہ بھی مکالمے سے ہوتا ہے۔

مکالمے کو بالکل نیچرل ہونا چاہیے۔ ہر کردار کے بات کرنے کا انداز دوسرے کردار سے مختلف ہونا چاہیے۔ کیوں کہ روزمرہ کی زندگی میں ہر کردار اپنی فطرت کے مطابق بات کرتا ہے اور ہر ایک کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ اس

لیے ناول میں بھی کرداروں کے مکالمے کو فطری ہونا چاہیے۔ مکالمے جتنے صاف، نیچرل اور موزوں ہوں گے قاری ان میں اتنی ہی دل چسپی لے گا کیوں کہ مکالمے پڑھنے کے بعد قاری کو وہ بالکل جیتے جاگتے کردار محسوس ہوں گے۔

اسلوبِ بیان سے مراد تحریر کی طرز اور بات کہنے کا ڈھنگ ہے کہ اس میں معانی اور بیان کا لحاظ، لفظوں کے استعمال میں دل آویزی اور خیال میں ندرت کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ اس کے لیے تین طریقے استعمال کیے گئے ہیں۔ اول یہ کہ دو یا دو سے زائد کرداروں کے خطوط کے مجموعے جمع کر دیے جاتے تھے اور اس طرح ترتیب دی جاتی کہ پورے قصے کو ظاہر کر دیں۔ اس میں ایک ہی واقعہ کئی خطوط میں شامل ہوتا تھا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ کوئی اہم کردار کسی قصے کو اپنی آپ بیتی کی طرح بیان کر دے مگر اس میں بھی قصے کا صرف ایک پہلو سامنے آتا تھا۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ناول نگار قصے کے ہر ضروری پہلو پر روشنی ڈالے۔ آج کل زیادہ تر دوسرے اور تیسرے طریقے سے ناول کو لکھا جاتا ہے۔

ناول میں جذبات نگاری کرداروں پر ہونے والے اثرات کے مد نظر ہوتی ہے مثلاً کردار کی پیار، غصے یا نفرت میں کیسی کیفیت ہوتی ہے یا کوئی کردار اپنے پیار، غصے اور نفرت کو دبانا چاہتا ہے تو اس کا کیا تاثر پڑتا ہے۔ اسی طرح کسی حسین عورت کے بارے میں مختلف لوگوں کے مختلف جذبات ہوتے ہیں مثلاً غریب کے الگ، ان پڑھ کے الگ، حساس کے الگ اور بے حس کے الگ جذبات ہوتے ہیں۔ جذبات چاہے جتنے بھی المناک، نشاط انگیز ہوں مگر حقیقی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں یعنی کہ جذبات نگاری کردار نگاری سے تعلق رکھتی ہے تو کرداروں کے فطری ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے جذبات بھی فطری ہونے چاہیے۔

ہر حساس شخص خاص طور پر ادیب کا دنیا کو دیکھنے اور محسوس کرنے کا الگ زاویہ اور الگ انداز ہوتا ہے۔ اسی بنا پر وہ اپنی رائے رکھتا ہے۔ اس کا اظہار وہ براہِ راست بھی کرتا ہے اور بالواسطہ بھی۔ چوں کہ ناول نگار کا اصل مقصد زندگی کو پیش کرنا ہے لہٰذا ممکن ہی نہیں کہ اس کی تصویر زندگی، اس کے اخلاقی، فلسفی، مذہبی وغیرہ خیالات کے حامل نہ ہو۔ ایسا ممکن ہے کہ ناول میں کوئی خاص نظریہ نہ ہو مگر پھر بھی ناول نگار اسے خاص نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ بعض چیزوں کو وہ پسند کرتا ہے تو بعض کو ناپسند کرتا ہے۔ اس لیے ہمیں اس کے ناول میں کہیں نہ کہیں اس کے فلسفہ حیات کے اشارے ملتے ہیں۔ چاہے وہ کتنے ہی دھندلے کیوں نہ ہوں۔ ناول نگار اسے بعض کرداروں کے ذریعے پیش کرتا ہے اور کبھی اپنے مواد اور موضوع کے سہارے سے اس چیز کو واضح کرتا ہے جیسے ناول میں پہلے رومانویت کے نظریات ناول پر حاوی تھے پھر اس کے بعد سیاسی، سماجی اور معاشی نقطۂ نظر ناول پر حاوی ہو گیا۔ اشتراکیت کے بعد یہ جگہ وجودیت نے لے لی۔ مگر ایک بات یاد رہے کہ پہلے سے ہی کوئی مستقل نظریہ رکھ کر ناول نہیں لکھا جاتا بلکہ ناول خود ہی اپنی فضا، برتاؤ اور ماحول کے تحت فلسفہ حیات میں ڈھل جاتا ہے۔

ناول میں طرزِ ادا کی خوبی ناول کے حسن کو بڑھا دیتی ہے۔ عوام ادبی ناول اس ناول کو سمجھتی ہے جس کی زبان عمدہ ہو مگر زبان کی عمدگی ناول کے لیے ضروری جزو نہیں ہے۔ ہاں اس سے ناول کے حسن میں اضافہ ضرور ہوتا ہے مگر جو چیز ضروری ہے وہ یہ ہے کہ زبان نقائص سے پاک ہو۔

ہر باسلیقہ ناول نگار قصے کو بیان کرنے یا کرداروں کو ظاہر کرنے کے لیے کسی نہ کسی تکنیک کا استعمال کرتا ہے۔ واقعات اور کرداروں کی ترتیب ایک خاص تکنیک یا کسی خاص اصول کے تحت استعمال میں لاتا ہے۔ بعض ناول نگار اس فن کاری کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں کچھ کم اور کچھ حد سے زیادہ انہماک دکھاتے ہیں۔ اس طرح ان کے فن میں آورد اور تصنع پیدا ہو جاتا ہے۔

منتخب اردو ناولوں میں نو آبادیات کا مطالعہ:

جب انگریزوں نے ہندوستان پر اپنا نو آبادیاتی تسلط قائم کیا تو اس سے ادب بھی متاثر ہوا۔ اس طرح ہندوستان میں انگریزی ثقافت اور انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی اصناف بھی متعارف ہونے لگیں۔ اب ان اصناف میں ناول، افسانہ وغیرہ شامل تھے اور وہ اصناف پہلے سے ہندوستان میں موجود نہیں جیسا کہ داستان وغیرہ، ان کو ترک کیا جانے لگا۔ نو آبادیاتی دور کی وجہ سے ہندوستان میں جو ادب تخلیق ہو رہا تھا وہ بھی سامراجی نظام سے متاثر تھا اور جو ادب تخلیق ہو رہا تھا وہ مغرب کی تقلید کر رہا تھا۔ انگریزی اصناف کے لکھے سوالوں کو کامیابی تو حاصل ہوئی مگر اس میں نقالی کے عناصر زیادہ تھے۔

اردو ناول کے ابتدائی دور میں مصنفین نے نو آبادیاتی نظام کو مضبوط کرنے میں مدد کی۔ وہ اس طرح کہ انھیں انگریزوں کی ہندوستان میں آمد اور ہندوستان پر حکومت کرنے میں کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ اسے اپنے لیے ایک نعمت سمجھ رہے تھے کہ اس طرح ہم ترقی کی راہ پر گامزن ہو رہے ہیں۔ ایسا ادب تخلیق کیا جا رہا تھا کہ جس میں عوام کو یہ سمجھانے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ ہندوستانی عوام کو نو آبادیاتی صورت حال میں خود کو ڈھال لینا چاہیے۔ اسی میں ان کی بھلائی بھی ہے اور ترقی بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ناول نگار کے ذہن میں ہندو اکثریت کا بھی خوف تھا کہ جس طرح انھوں نے انگریزوں کی خوشامدیں کر کے اپنے لیے آسانی پیدا کر لی ہے تو اسی طرح انھیں ہندو اکثریت سے بھی خطرہ لاحق ہوتا تھا۔ اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ اگر ہمیں آگے بڑھنا ہے تو انگریز حکومت کو تسلیم کر کے ان کے ساتھ چلنا پڑے گا۔ اس طرح نو آبادیات نے ایسے طبقے کو اپنے لیے استعمال کیا۔ اس طبقے کی ذہن سازی میں رسائل و جرائد، صحافت، مضامین، ڈرامہ، مکاتیب اور حقیقی قصوں سے ملتی جلتی کہانیوں نے اہم کردار ادا کیا۔

> فارسی اور ہندی چھاپ کی اس زمانے کی یہ زوال پذیر تہذیب جب ۱۸۵۷ء میں ایک بدیسی لیکن
> جاندار تہذیب کے ہاتھوں ذبح ہوئی تو خون گرم دہقاں نے نئے خرمنوں کے لیے نئے ہیولے تیار

کیے۔ تہذیب کے مرجھائے درخت میں ایک نیاخون زندگی دوڑا، نئے پھول، نئی پتیاں اور کلیاں نکلنے لگیں۔ غالبؔ نے اپنے خطوط لکھنے کا ڈھنگ بدلا۔ سرسید نے اپنی "آثار الصنادید" کا تیسرا ایڈیشن خود نئے ڈھنگ پر لکھا۔ مطبع ۱۸۳۵ء سے قائم ہو چکے تھے۔ مضمون نگاری نئے ڈھنگ سے ہونے لگی۔ طلسمی خیال آرائیوں کے بجائے واقعات نگاری اور طرزِ تحریر پر تکلف اور بناوٹی عبارت آرائی کے بجائے سلاست اور سادگی نے رواج پایا۔ قدیم فارسی اور سنسکرت اور عربی ادب العالیہ کے بجائے ذہن سات سمندر پار کے مصنفین سے کسبِ فیض کرنے لگا۔ کتابی سند کے بجائے فطرت انسانی مسند حکومت پر بیٹھی، تخیل کی جگہ پر عقل اور مفروضہ کے بجائے موجودہ کا دور دورہ ہوا۔[۲]

ابن الوقت (۱۸۸۸ء):

ابن الوقت ڈپٹی نذیر احمد کے دوسرے ناولوں کے مقابلے میں فکری اعتبار سے مختلف ہے۔ جہاں ابتدائی ناولوں میں ڈپٹی نذیر احمد انگریزوں کی حمایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہاں اس ناول میں قدرے مختلف اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ اب ان کی سوچ میں تبدیلی پیدا ہوئی ہے اور اپنے ناول کے ذریعے وہ یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ انگریزی تمدن کو اپنائیں مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنی روایات کو نہ بھولیں۔ اپنی روایات اور اپنی تہذیب کو نظر انداز نہ کریں۔ انگریزوں کے خلاف جو مزاحمت ہو رہی تھی، ڈپٹی نذیر احمد نے اسے بھی پیشِ نظر رکھا۔ خاص طور پر اکبر الہٰ آبادی کی شاعری سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ اس ناول میں مزاحمت اور معاشرتی دباؤ کو دکھایا گیا ہے۔ اس ناول کے کردار ابن الوقت کی طرح انھیں انگریز حکومت کے سامنے بے بس نہیں ہونے دیتے۔ اس ناول میں ہمیں ناول نگار کی سوچ میں تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وقت کے ساتھ ضرور آگے بڑھو مگر اتنا بھی نہیں کہ منہ کے بل گر پڑو اور اٹھ بھی نہ سکو۔ خود میں تبدیلی لاؤ مگر ایک توازن قائم رکھو۔

اس ناول میں نو آبادیاتی عہد میں ہونے والی ترقی کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے ساتھ حکمرانوں کے بدلتے چہرے اور ان کے بدلتے ہوئے رویے سامنے آتے ہیں۔ اشرافیہ کی وجہ سے ہندوستانیوں کو جنگِ آزادی میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور اس وجہ سے انھیں انگریزوں کی غلامی کرنی پڑی۔ اس کے بعد انگریزوں نے ہندوستانیوں پر اپنا حق جمانا شروع کر دیا۔ اس قسم کی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں جس سے ہندوستانی عوام محرومیوں کا شکار ہوتی گئی۔ یہ ہی وجہ ہے کہ ناول کے کردار ابن الوقت کو یقین ہے کہ:

> ایک غدر نہیں ایسے ہزاروں غدر کیوں نہ ہوں، انگریزی عمل داری جانے والی نہیں بلکہ غدر کے بعد جو تسلسل بیٹھے گا، پہلے سے زیادہ مستحکم اور پائیدار ہو گا۔[۳]

اسی یقین کی بدولت ابن الوقت نے ناول کے آغاز میں غدر کے واقعے میں زخمی ایک انگریز کی مدد کی۔ اس کی حفاظت کی اور اسے باغیوں سے محفوظ بھی رکھا۔ اس کے ساتھ جتنا عرصہ رہا اتنے عرصے میں اس نے انگریزوں کے بارے میں بہت کچھ جان لیا تھا۔ انگریزی تمدن کے بارے میں بہت کچھ سیکھ لیا تھا اور ان سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ جب انگریز فوج نے حالات پر قابو پایا تو مسٹر نوبل اور انگریز حکومت ابن الوقت پر بہت مہربان ہو گئی۔ انگریز حکومت نے اسے سرکاری عہدے سے بھی نوازا۔ اس پر ابن الوقت نے خود کو مکمل طور پر انگریزی کلچر میں ضم کر دیا۔ ان کے جیسا لباس، رہن سہن کو اختیار کر لیا۔ پھر ایسا وقت آتا ہے کہ نوبل کی جگہ مسٹر شارپ تعینات ہو جاتا ہے۔ شارپ ابن الوقت کو حقارت سے دیکھتا ہے۔ ابن الوقت میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ تم لوگ بے شک ہمارے طور طریقے، ہمارا رہن سہن اپنا لو مگر کبھی بھی ہمارے جیسے نہیں بن سکتے۔ ناول نگار کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ انگریز وضع کے ساتھ ساتھ اسلام کا نبھانا مشکل ہے جیسے نماز پڑھتے ہوئے انگریزی لباس پہنا ہو تو کس طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

> انگریزی وضع کے ساتھ نماز روزے کا نبھنا ذرا مشکل، کوٹ تو خیر اتار الگ کھونٹی پر لٹکا دیا۔ کم بخت پتلون کی بری مصیبت تھی کہ کسی طرح بیٹھنے کا حکم ہی نہیں، اتارنا پھر پہننا بھی وقت سے خالی، اس سے کہیں زیادہ وقت طہارت کی تھی جو نماز کی شرط ضروری تھی۔[۴]

نو آبادیاتی نظام ثنویت پر قائم ہوتا ہے اور تقسیم کا اختیار نو آبادکار کو ہوتا ہے۔ ایک کا اگر فائدہ ہوتا ہے تو دوسرے کا نقصان ہوتا ہے۔ کیوں کہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ زندگی کے ہر معاملے، ہر شے میں عمارات، رہائش، ہر شے میں ثنویت پائی جاتی ہے۔ بقول ناصر عباس نیر:

> نو آبادکار اپنی شخصیت، اپنی ثقافت، اپنے علمی ورثے، اپنے سیاسی نظریات، اپنے فنون کے بارے میں جو آرا پھیلاتا ہے، وہ نو آبادیاتی دنیا کے افراد کی شخصیت، ثقافت، علم اور فنون کے متعلق موجود آرا کے متضاد اور انھیں بے دخل کرنے والی ہوتی ہیں۔[۵]

مقامی باشندوں کو یہ ذہن نشین کرایا جاتا ہے کہ وہ کیا ہیں؟ اور کیا تھے؟ ہمارے آنے سے پہلے وہ کس حال میں تھے؟ انھوں نے ماضی میں کس طرح کے عذاب جھیلے وغیرہ وغیرہ۔ پھر آخر میں انھیں یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ ہم ان کی بھلائی کے لیے یہاں آئے ہیں اور ایسے اقدامات کرتے ہیں کہ وہاں کے لوگوں کو یقین ہو جائے کہ یہ ہماری بھلائی چاہتے ہیں۔

جب یہ ناول لکھا گیا نذیر احمد اس مرحلے پر تھے کہ خود کو بالکل انگریزوں کے رنگ میں نہیں ڈھالنا۔ یہ نہ ہو ان کی ثقافت اپنا کر اپنی روایات، اپنی ثقافت سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ اس کے لیے ناول میں جو کردار حجۃ الاسلام ہے وہ

اس کام کو بخوبی انجام دیتا ہے جو انگریزی کلچر سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے اور آخر کار ابن الوقت بھی دوری اختیار کر لیتا ہے۔ چوں کہ مسٹر شارپ نے جب ابن الوقت کو دیکھا تو اسے اس بات کا خطرہ پڑ گیا کہ اگر اس نے نو آبادیاتی تمدن اختیار کیا اور بعد میں ہم سے حقوق مانگنے لگ گیا تو اس سے نو آبادیات کے خلاف مزاحمت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لیے وہ چاہتا تھا کہ ابن الوقت خود کو انگریزی تمدن سے دور رکھے۔ وہ اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ یہاں تک کہ اسے اس بات پر بھی اعتراض تھا کہ کوئی ہندوستانی ہماری تعلیم حاصل کرے:

> انگریزی پڑھ کر یہ لوگ ایسے زبان دراز اور گستاخ اور بے ادب ہو گئے ہیں کہ سرکاری انتظام پر بڑی سختی کے ساتھ نکتہ چینیاں کرتے ہیں۔[۷]

مسٹر شارپ کو اسی بات کا خوف لاحق تھا کہ کہیں یہ مقامی لوگ ہمارے خلاف مزاحمتی کاروائی نہ شروع کر دیں یا اپنے حقوق کا مطالبہ نہ کریں۔ ابن الوقت ہندوستانی کلچر کو برا بھلا کہتا تھا اور انگریزی کلچر کی تعریف کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ جیسے اس سے پہلے مجھے ہندوستان میں برابری کا حق ملا ہوا تھا مجھے اسی طرح اب انگریزوں کے دور میں بھی برابری چاہیے جو کہ مسٹر شارپ کو بالکل گوارا نہ تھا۔ اس لیے وہ ابن الوقت سے نفرت کرتا تھا۔

ابن الوقت اس طبقے کا ترجمان ہے جو نو آبادیات کے حمایتی تھے، جو پڑھ لکھ کر انگریزوں کی دی گئی ملازمتوں کے خواہش مند تھے اور چاہتے تھے کہ انگریز حکمران ان سے خوش ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ انھیں یہ ڈر بھی تھا کہ ہندو بھی انگریزی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور آگے بڑھ رہے ہیں۔ اگر ایسا ہی رہا اور ہم نے انگریزی تعلیم حاصل نہ کی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ صدیوں ہم نے جن ہندوؤں پر حکومت کی، آنے والے وقتوں میں ہمیں ان کی غلامی نہ کرنی پڑ جائے۔ اس لیے وہ ضروری سمجھتے تھے کہ پڑھ لکھ کر ہمیں غلامی سے بچنا ہے۔

ہندوستانی عوام نے اپنی سیاسی، معاشی تمام ذمہ داریاں انگریزوں کے حوالے کر دی تھیں اور جب کسی ریاست کو غیر ملکی آ کے سنبھالے اور غیر ملکی قوتوں کا حکم چلے تو اس ریاست کے لوگ پستے چلے جاتے ہیں۔ مقامی باشندے غیر ملکی حکومت کے غلام ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پھر جیسا حکمران کہتے ہیں انھیں ویسا کرنا پڑتا ہے اور نچلے درجے کی ملازمتوں کے عہدے دیے جاتے ہیں جن سے ان کا گزر بسر مشکل سے ہوتا ہے اور وہ آگے نہیں بڑھ پاتے۔ ابن الوقت کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ اس نے نو آبادیاتی تمدن کو اپنا لیا۔ انگریزوں کے رنگ ڈھنگ اور رہن سہن کو اپنا لیا، نوکری بھی مل گئی مگر وہ ان کی برابری نہ کر سکا اور یہ بھی اسے مسٹر شارپ نے نہ کرنے دی جس وجہ سے ابن الوقت اور مسٹر شارپ دونوں ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ابن الوقت کو سرکاری نوکری تو مل گئی مگر اس کے باوجود اس کے ذہن میں انگریز حاکم کو خوف رہتا ہے۔

نو آبادیاتی عہد میں ہونے والی ترقی کو دیکھا جائے تو ناول میں اس کا ذکر ملتا ہے جیسا کہ ریل گاڑی اور دوسری

مشینیں وغیرہ اور اس ترقی کو خالص ترقی نہیں کہا جاسکتا۔ کیوں کہ انھوں نے جو کام کیے وہ اپنی غرض اور اپنے مقاصد کو انجام تک پہنچانے کے لیے کیے اور وہاں کے زمینداروں کے لیے جینا محال کر دیا۔ ان کے لیے زمین داری ایک مصیبت بن گئی۔ اسے ڈپٹی نذیر احمد ابن الوقت کے روپ میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> پچھلی سلطنتوں میں ہر گاؤں بجا، خود ایک چھوٹی ریاست تھا۔ اب سرکار اکثر ریاستوں کے انتظام مالگزاری نے زمین داروں کو ایسا مجبور اور بے دست و پا کر دیا ہے کہ اکثر صورتوں میں زمین داری ایک مصیبت ہو گئی ہے۔[۷]

ہندوستان میں جو ترقی ہوئی اس کا سب سے زیادہ فائدہ انگریز حکمران کو ہوا۔ اس کے علاوہ وہ طبقہ جو نوآبادیات کا حمایتی تھا۔ انگریزوں نے ان کے لیے بھی آسانیاں پیدا کیں، انھیں نوکریاں دیں مگر وہ طبقہ جو انگریزوں کے خلاف تھا انھیں بہت ظلم و ستم اور نقصانات اٹھانے پڑے۔ اس کے ساتھ ساتھ مزدور طبقہ، کسان مشکلوں سے گزر بسر کر رہا تھا۔ وہ اپنی پیداوار کو غیر ملکی قوتوں کے باعث سستے داموں بیچ دیتے تھے۔ اس طرح ان کا استحصال ہوتا رہا۔

ناول میں ایک ڈپٹی کلکٹر جو ہندوستانی ہے اور سرکاری ملازمت کرتا ہے، وہ اپنی ملاقات کا حال بیان کرتا ہے کہ کس طرح یہاں حاکم اور محکوم کے رشتے کو برقرار رکھا جاتا ہے:

> اتنی مدت مجھے نوکری کرتے ہوئی اور چھوٹے بڑے صدہا انگریزوں سے میری معرفت ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں خوشی سے کبھی کسی انگریز سے ملنے گیا ہوں یا کسی انگریز سے مل کر میری طبیعت خوش ہوئی ہو۔۔۔ بڑے مؤدب مقطع بن کر ہاتھ باندھے نیچی نظریں کیے ڈرتے ڈرتے، دبے پاؤں کوٹھی کی طرف کو بڑھے۔۔۔ آخر ناچار ستون کی آڑ میں جوتیاں اتار ہمت کر کے بے بلائے اور پہنچے، کرسی نہیں، مونڈھا نہیں، فرش نہیں، کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں؟ لوٹ چلیں، پھر خیال آتا ہے کہ ایسا نہ ہو لوٹتے کو صاحب اندر آئینوں میں سے دیکھ لیں۔۔۔۔ غرض بلائے گئے، صاحب کو دیکھا تو پائپ منھ میں لیے ٹہل رہے ہیں۔۔۔ سر جھکائے کوئی کاغذ یا کتاب دیکھ رہے ہیں۔ اب کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی کیوں کہ ان کو خبر کروں کہ میں آیا کھڑا ہوں۔ شاید جان بوجھ کر کھڑا رکھا ہو۔۔۔ آخر آپ ہی سر اٹھایا۔ ڈپٹی صاحب حاکم بالا دست ہو کر جو اتنی آؤ بھگت کر لے تو اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ صاحب نے بندہ نوازی میں کچھ کمی نہیں کی، آنکھیں چار ہوتے ہی اپنے مقابل دوسری کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کہنے کو تو کرسی پر بیٹھا مگر حقیقت میں بید پر چوپڑ ٹیکے ہوں تو جیسے چاہے قسم لے لو۔۔۔ کرسی پر بیٹھنا تھا کم بخت چپڑاسی نے پیچھے سے ہاتھ جوڑ کر گیا۔ خداوند سررشتہ دار حاضر ہیں۔[۸]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز حکمرانوں نے اپنے اور ہندوستانیوں کے بیچ ایک فرق رکھا ہوا تھا جو انھیں چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے یاد دلایا جاتا تھا۔ انھیں بار بار یہ یاد کروایا جاتا تھا کہ ہم حاکم ہیں اور تم محکوم ہو۔ ہندوستانی ملازمین ان کے انتظار میں گھنٹوں کھڑے رہتے۔ نوابین کے دربار میں سلام کے لیے گھنٹوں کھڑے ہونا ہوتا تھا۔ آخر جا کر سننے کو ملتا تھا کہ سلام قبول ہے اب جائیں۔ ہندوستانیوں کو بہت حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور ان کے ساتھ بہت بدسلوکی کی جاتی تھی۔

ناول میں حجتہ الاسلام ایک اہم کردار ہے جب مسلمانوں کو عیسائیت کے قریب لانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں اور اسلام سے دوری اختیار کرنے کو کہا جا رہا تھا تب حجتہ الاسلام نے ان سازشوں کو روکنے کی بھرپور کوشش کی اور اسی کردار کی وجہ سے ابن الوقت کو بھی احساس ہوا۔ چوں کہ شارپ کے رویے نے بھی ابن الوقت کو انگریزوں سے دوری پر مجبور کر دیا تھا اور وہ حجتہ الاسلام کی باتوں سے بھی متاثر ہوا تو اس نے انگریزوں سے دوری اختیار کر لی۔

ناول کے آخر میں ابن الوقت کو احساس ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو برا بھلا کہا وہ انگریزوں کے ساتھ جا ملا۔ انہی انگریزوں نے اسے دھتکارا، اسے برابری کا درجہ نہ دیا۔ اسے احساس ہوا کہ انگریز قوم صرف خود کو برتر سمجھتی ہے۔ ان کی نظر میں باقی تمام قومیں ان سے بدتر ہیں۔ وہ ہمیں بس اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ ہمیں کبھی بھی برابری کا درجہ نہیں دے سکتے۔

ابن الوقت سے ڈپٹی نذیر احمد کے خیالات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جہاں پہلے وہ ہر جگہ انگریزوں کی حمایت کرتے نظر آتے تھے۔ ویسا اب بالکل نہیں ہے، اب ان کے خیالات میں تبدیلی آگئی ہے اور وہ انگریز حکمرانوں کی چالوں اور ان کے مقاصد کو سمجھنے لگے ہیں۔

گئودان (۱۹۳۵ء):

پریم چند کے لکھے گئے ناول گئودان کی کہانی ایک کسان سے جڑی ہوئی ہے۔ یہ کسان ناول کا مرکزی کردار ہے جس کا نام ہوری ہے جو کہ ایک ہندو کسان ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے گھر کے دروازے پہ ایک گائے ہو۔ اسی سلسلے میں وہ گجر سے مدد مانگتا ہے، گجر کو کسی لڑکی سے شادی کا لالچ دیتا ہے اور اپنی باتوں میں پھنسا کر اس سے گائے لے آتا ہے۔ جب گھر لاتا ہے تو اس کے گھر والے گائے کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں مگر اس کا ایک بھائی جس کا نام ہیرا ہوتا ہے وہ اس سے بہت حسد کرنے لگتا ہے اور اسی حسد میں آکر وہ ہوری کی گائے کو زہر دے کر مار دیتا ہے۔ اس کے بعد ہوری بہت قرض دار ہو جاتا ہے۔

ہوری کا ایک بیٹا جس کا نام گوبر ہے وہ ایک لڑکی سے تعلقات بڑھاتا ہے اور اس سے شادی کر کے اسے گھر لے آتا ہے مگر معاشرہ ان کی شادی کو قبول نہیں کرتا تو گوبر گھر چھوڑ کر شہر بھاگ جاتا ہے۔ بیٹا شہر چلا جاتا ہے مگر

اس کی غلطی کی سزا اس کے کسان باپ ہوری کو بھگتنی پڑتی ہے۔ اس پر بھاری تاوان لگایا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ پہلے سے بھی زیادہ ذلت کا شکار ہو جاتا ہے۔ گوبر شہر جا کر ترقی کر لیتا ہے۔ خود کو شہر جیسے ماحول میں ڈھال لیتا ہے۔ ہر وقت پیسے کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے۔

گوبر گاؤں واپس لوٹتا ہے تو وہ خود کو گاؤں والوں سے بہت مختلف اور ایک اچھا شہری سمجھتا ہے۔ باپ پر لگے تاوان کو بھی کسی حد تک ختم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے مگر اپنے باپ سے اس کی ایک ہی بات پر بحث ہوتی ہے کہ وہ اتنی سادگی سے کیوں رہتا ہے۔ دنیا کی چالاکی کو سمجھتا کیوں نہیں ہے۔ اسی وجہ سے باپ کو چھوڑ کر پھر سے بیوی کے ساتھ شہر واپس چلا جاتا ہے مگر اب کی بار حالات پہلے سے مختلف ہوتے ہیں اور گوبر گھر چلانے میں ناکام رہتا ہے۔ اسے نشے کی عادت لگ جاتی ہے۔ شوگر مل میں کام کرتا ہے، وہاں لڑائی جھگڑے کے باعث گھر میں زخمی حالت میں لوٹتا ہے۔ اس کی بیوی اسے زخمی حالت میں دیکھتی ہے جسے ناول نگار نے اس طرح بیان کیا:

> جھنیا نے گوبر کا وہ بے جان سا جسم دیکھا تو اس میں انسانیت پیدا ہو گئی۔ اب تک اس نے اسے طاقت کی شکل میں دیکھا تھا جو اس پر حکومت کرتا تھا اور اسے ڈانٹتا مارتا تھا۔ آج وہ ناکارہ، بے بس اور قابل رحم تھا۔[۹]

گئودان میں نو آبادیاتی نظام کی خامیوں کو اجاگر کیا گیا ہے کہ کس طرح انگریز حاکموں کے بعد ہندوستان کے حاکموں نے نچلے طبقے پر ظلم کرنا شروع کر دیا۔ خاص طور پر کسان طبقے کا استحصال کیا۔ عوام سے لگان اکٹھا کرتے رہتے ہیں۔ یہ سب نو آبادیاتی نظام کا نتیجہ ہے۔ پہلے نچلے طبقے پر انگریز حکومت ظلم و ستم کرتی رہی۔ اس کے بعد خود ہی ہندوستانی عوام نچلے طبقے کا استحصال کرنے لگ گئی۔ ہندوستانی حاکم بس انگریزوں کو خوش کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ انگریزوں کو ہندوستانی عوام کی فلاح و بہبود سے کوئی غرض نہیں۔ اس کا تذکرہ ہم ناول میں بھی دیکھتے ہیں:

> اس نظام نے ہم زمین داروں میں کتنی عیش پسندی، کتنی بد چلنی، کتنی غلامی اور کتنی بے شرمی بھر دی ہے۔ یہ میں خوب جانتا ہوں مگر ان ہی وجوہ سے اس کی مخالفت نہیں کرتا۔ میرا تو یہ کہنا ہے کہ اپنے سوارتھ کے خیال سے بھی اس کی حمایت نہیں کی جا سکتی۔ اس شان کو نبھانے کے لیے ہمیں اپنے ضمیر کا اتنا خون کرنا پڑتا ہے کہ ہم میں خود داری کا نام بھی نہیں رہ گیا۔ ہم اپنی اسامیوں کو لوٹنے کے لیے مجبور ہیں۔ اگر افسروں کو قیمتی قیمتی ڈالیاں نہ دیں تو باغی سمجھے جائیں اور شان و شوکت سے نہ رہے تو کنجوس کہلائیں۔[۱۰]

اس طرح کے وڈیروں اور نوابوں میں غیرت نام کی بھی نہیں رہی۔ وہ بالکل بے حس ہو چکے ہیں۔ وہ عوام کے ساتھ مخلص ہیں نہ حکمران کے ساتھ۔ انھیں صرف اپنا مفاد پورا کرنا ہے چاہے وہ عوام کو تنگ کر کے پورا کریں،

ان کا حق کھا کر پورا کریں یا حکمرانوں کی خوشامد کر کے ان سے اپنے کام نکلوائیں۔ اس کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ نچلے طبقے کے لیے حکمران اور نواب زادے دونوں ہی خطرے اور پریشانی کا باعث ہیں۔ انھیں دونوں سے ہی تکلیفیں ملتی ہیں۔ دونوں مل کر نچلے طبقے کا استحصال کرتے ہیں۔ ایسے وڈیروں، نوابوں اور جاگیرداروں کے خلاف ہمیشہ لکھتے رہے۔ پریم چند کے ناولوں میں اسے کردار دیکھنے کو ملتے ہیں جو کبھی رائے صاحب تو کبھی راجہ صاحب جیسے نام دے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پریم چند نے نچلے طبقے کے لیے ہمیشہ آواز اٹھائی۔ ہمیشہ ان کی حمایت کی اور ان کا استحصال کرنے والوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ گئودان کا جاگیردار کسانوں کا استحصال کرتے ہوئے اپنی مجبوری کچھ اس طرح سے بتاتا ہے:

> مجھے کیا اچھا لگتا ہے کہ میں بے جان کسانوں کا خون چوسوں اور اپنے کنبے والوں کو نفس پرستیوں کے ذرائع مہیا کروں مگر کروں کیا؟ جس انتظامی فضا میں میری پرورش اور بالیدگی ہوئی، اس سے نفرت ہونے پر بھی اس کا موہ چھوڑ نہیں سکتا اور اسی چکر میں رات دن پڑا رہتا ہوں کہ کسی طرح عزت آبرو بچی رہے اور ضمیر کا خون نہ ہونے پائے۔ [۱۲]

جاگیردار ایک طرف تو نچلے طبقے کا استحصال کر رہے ہیں اور دوسری طرف خود کو مجبور بھی ثابت کر رہے ہیں کہ وہ یہ سب مجبور ہو کر کرتے ہیں، ان میں ان کی خوشی نہیں ہوتی۔ اس طرح تو انگریزوں کا بھی کوئی جرم نہیں بنتا کہ ان کے پاس وسائل کی کمی تھی اس لیے وہ اپنی بقا کی خاطر کالونیاں بناتے گئے۔ مطلب کہ ہندوستان میں آ کر ہندوستانیوں کا استحصال کرنا ان کی مجبوری تھی۔

پریم چند گئودان میں زندگی کی حقیقت کو سامنے لاتے ہیں اور اس طرح سے سامنے لاتے ہیں کہ ایک کسان کی سماجی، معاشی قدریں نمایاں ہوتی ہیں۔ پریم چند کا نقطۂ نظر سماجی اصلاح تھا، اس لیے ان کے ناول میں ہندوستان کے سیاسی، معاشی حالات، اس وقت جو تحریکیں جنم لے چکی تھیں اور سماجی بیداری دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ ہندوستان میں سماجی حقائق کی تلخیاں ذات پات کے مسائل اور مذہبی اجارہ داری کو اپنے ناول میں کھل کر بیان کیا ہے۔

اس ناول کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مسائل کا اٹھاؤ ہے۔ معاشرہ طبقاتی کش مکش کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ دیہاتی زندگی میں کیسے جاگیردار کسانوں کا استحصال کرتے ہیں اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔
پریم چند دوسرے ناول نگاروں سے بالکل مختلف ہیں۔ وہ کسی بھی حال میں انگریزوں کی غلامی اور ان کی پیروی نہیں کرنا چاہتے۔ اس کا اندازہ ان کے ناولوں سے ہو جاتا ہے کہ انھوں نے انگریزوں کی ہر گندی اور ناپاک چال کو کھول کر عوام کے سامنے رکھ دیا۔ وہ نو آبادیات کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ ان کے لیے یہ صورت حال قابلِ

نفرت ہے کہ یہاں کی عورتیں پہلے چار دیواری میں رہتی تھیں۔ اب ان حکمرانوں کی بدولت عورت کو بے شرمی کی طرف دھکیل دیا گیا ہے۔

پریم چند اپنی تحریروں کے ذریعے انقلاب لانا چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ نعرے نہیں لگاتے، گلی گلی تقریریں نہیں کرتے بلکہ جو دیکھتے ہیں اسے قلم بند کر دیتے ہیں۔ جبر کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور اسے نہایت ہی سلیقے سے کہانی میں ڈھال دیتے ہیں۔

اداس نسلیں (۱۹۶۳ء):

عبداللہ حسین کا ناول اداس نسلیں تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن کے درج ذیل عنوانات ہیں:

۱۔ برٹش انڈیا

۲۔ ہندوستان

۳۔ بٹوارا

ناول اداس نسلیں میں ہندوستان کی تاریخ اور اس کے سیاسی و سماجی حالات دکھائے گئے ہیں جن میں پہلی جنگِ عظیم، جلیاں والا باغ کا قصہ، کانگریس کی انگریز حکومت کے ساتھ مزاحمت، مسلم لیگ کا کردار، بنگال میں قحط اور بٹوارے کے وقت ہندوستانی عوام پر کیے جانے والے ظلم و تشدد شامل ہیں۔

ناول میں دو خاندانوں کا ذکر ہے جن میں ایک خاندان روشن آغا کا ہے اور دوسرا ایاز بیگ اور نیاز بیگ کا خاندان ہے۔ روشن آغا بہت بڑا اثر و رسوخ کا مالک اور جاگیر دار ہے۔ جب کہ ایاز بیگ اور نیاز بیگ کسان ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار نعیم ہے جو نیاز بیگ کا بیٹا ہے۔ نعیم اپنی تعلیم حاصل کرنے کے لیے کلکتہ جاتا ہے اور تعلیم مکمل کر کے واپس اپنے گاؤں روشن پور آجاتا ہے۔ نعیم کو روشن آغا کی بیٹی عذرا سے محبت ہو جاتی ہے۔ جب نعیم روشن پور واپس آتا ہے تو اسے فوج میں زبردستی داخل کر کے یورپ محاذ پہ بھیج دیا جاتا ہے۔ اس وقت جنگِ عظیم کا آغاز ہوتا ہے۔ نعیم افریقہ جاتا ہے۔ اس وقت جنگِ عظیم کا آغاز ہوتا ہے۔ نعیم افریقہ جاتا ہے جہاں اس کا ایک بازو کٹ جاتا ہے۔ جنگ سے واپسی پر اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ یہ انگریز حکومت اور ان کے ساتھ ہماری ہندوستانی عوام مل کر ہمارا خون چوس رہے ہیں۔ نعیم جب واپس آجاتا ہے تو کانگریس میں شامل ہو جاتا ہے۔

ناول میں کسی ایک کردار کی کہانی نہیں، پوری ایک نسل کی تاریخ ہے۔ یہ نسل ۱۸۵۷ء میں ایک آشوب میں داخل ہوئی اور ۱۹۴۷ء میں ایک طویل جدوجہد کے بعد اسے وطن کی خوشبو سے آشنائی ہوئی تھی۔ ناول میں دیہاتی زندگی کی عکاسی بہت اچھے طریقے سے کی گئی ہے۔ اس میں مختلف طبقوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ قیدی، سیاسی لیڈر، ہجرت، نفرت، محبت، میدانِ جنگ، جیل، فسادات یہ سب اس ناول کا حصہ ہیں۔ ناول کا موضوع برطانوی

ہندوستان ہے۔ اس کے واقعات کی ابتدا ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے ہوتی ہے اور اس کا اختتام قیام پاکستان کی شکل میں ہوتا ہے۔

اداس نسلیں میں عبد اللہ حسین نے جن واقعات کا ذکر کیا ہے ان میں ایک واقعہ پہلی جنگِ عظیم کا بھی ہے۔ جب نعیم تعلیم حاصل کر کے روشن پور واپس آتا ہے تو اسے زبردستی فوج میں بھرتی کر کے محاذ پہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ہندوستانیوں کی مرضی کے خلاف ان کے ساتھ زبردستی جبر اور استحصال کی علامتیں ہیں۔ اسی طرح جنگ کے حالات ،انگریزوں کی مکاریاں اور سیاسی تبدیلیاں اس ناول کا حصہ ہیں۔

ایک اور اہم واقعہ جلیانوالہ باغ کا ہے جس میں لوگوں کو نہایت بے دردی کے ساتھ مارا گیا۔ یہ سانحہ ہندوستان کی تاریخ خصوصاًسیاسی اور آزادی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ہندوستانی تاریخ میں ۱۹۱۹ء کا سال ظلم و جبر کی انتہاؤں کا سال تھا۔ ناول میں اس واقعہ کے بارے میں یوں بیان کیا گیا ہے:

> یہ سارا قصہ چند لمحے کا ہے۔ چند گز کے فاصلے پر کنواں تھا۔ وہ خشک کنواں تم دیکھ رہے ہو؟ میرے ساتھ بھاگتے ہوئے زیادہ تر لوگ اس میں جا گرے۔ ان کے اوپر دوسری طرف سے آنے والے گرے۔ پھر اس میں ہر طرف سے آنے والے زندگہ اور مردہ لوگ گرنا شروع ہوئے اور انسانوں کی چیخوں نے گولیوں کی آواز کو دبا دیا۔ میرے دیکھتے دیکھتے کنواں مردہ اور نیم مردہ لوگوں سے بھر گیا اور لوگ آسانی کے ساتھ اس پر سے دوڑتے ہوئے گزرنے لگے۔ گولیوں کی بوچھاڑ کے نیچے نیچے دوڑتا ہوا میں اس دیوار کے پاس سے گزرا جہاں میں آپ بیٹھا ہوں۔ [۱۲]

اس واقعے نے ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف شدت سے نفرت پیدا کر دی اور پھر تحریک عدم تعاون، تحریک ترک موالات اور تحریکِ خلافت اس کی مزید کڑیاں ثابت ہوئیں۔ ہندوستانی ادیب نے بھی اس سانحے کو موضوع بنا کر انگریزوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ محمد خرم ٹوانہ لکھتے ہیں کہ:

> اداس نسلیں کو تین نسلوں کی کہانی قرار دیا جاتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ان تینوں نسلوں کے تانے بانے میں سیاست کا عنصر بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اس عنصر کی بدولت نسلوں کی کہانی ایک وحدت میں بدل جاتی ہے۔ [۱۳]

ناول کا مرکزی کردار نعیم ایک ایسا متحرک کردار ہے جس کے ارد گرد پوری کہانی گھومتی ہے۔ نعیم مختلف کیفیات کا حامل ہے۔ پرورش سے ملازمت تک اور پھر ملازمت سے بڑھاپے تک نعیم میں اپنوں کی نظروں کے سامنے ہجوم میں گم ہو جانے تک نعیم کی مختلف پرتیں سامنے آتی ہیں۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جو دیہات میں بڑا ہوا اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد اور تمام تر حالات کا سامنا کرنے کے بعد بھی اسے اپنا گاؤں اچھا لگتا ہے۔ اس میں انا کا سفر جاری

رہتا ہے مگر اس کے پیچھے بھی اس کے جذبات کارفرما ہوتے ہیں۔ جب فوج کی بھرتی کے لیے گاؤں کے لوگوں کو منتخب کیا جارہا تھا تب زیادہ تر لوگ کھیتوں میں چھپ گئے مگر تب نعیم خود بخود سامنے آ گیا۔ اس کے پیچھے بھی جذبات ہی تھے کیوں کہ نیاز بیگ کی گرفتاری کے بعد ان کے خاندان کا کوئی فرد سرکاری ملازمت نہیں کرسکتا تھا اور نعیم اس داغ کو مٹانا چاہتا تھا، اس لیے اس نے خود کو پیش کر دیا۔

نعیم کی شخصیت کے متضاد پہلو دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ناول کے شروع میں نعیم کا رویہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے دوست کے ساتھ مل کر ان کے دشمنوں کو بھی قتل کرنے سے گریز نہیں کرتا مگر بعد میں جب نعیم ایسے گروہ کے ساتھ شامل ہوتا ہے جو تشدد کی بنا پر ملک کی تقدیر بدلنا چاہتے ہیں تو یہاں پہنچ کر نعیم عدم تشدد کا قائل ہو جاتا ہے۔ اس کے نزدیک لوگوں کو مارنے سے انقلاب نہیں آتا بلکہ عدم تشدد سے ہی منزل حاصل کی جاتی ہے۔

> میں ہندوستان کو اس کی کمزوری کی وجہ سے عدم تشدد اختیار کرنے کا مشورہ نہیں دے رہا بلکہ میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان اپنی طاقت اور قوت کا احساس رکھتے ہوئے عدم تشدد کو اختیار کرے۔ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ وہ یہ جانے کہ وہ اپنے اندر ایک ایسی روح رکھتا ہے جو تباہ ہونا نہیں جانتی اور جو ہر جسمانی کمزوری پر غالب آسکتی ہے۔ میں ان لوگوں کو جو تشدد پر یقین رکھتے ہیں، دعوت دیتا ہوں کہ وہ غیر متشدد اور امن پسند ترک موالات کا ایک دفعہ تجربہ کر کے دیکھیں میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ عدم تشدد اپنی کسی اندرونی ذاتی کمزوری کی وجہ سے ناکام ثابت نہیں ہو گا۔[۳۱]

اداس نسلیں میں جہاں نو آبادیاتی عہد کے مختلف پہلو دکھائے گئے ہیں ان میں ایک پہلو مزدوروں کے استحصال کا بھی ہے۔ صنعت کاروں کو صرف اپنی صنعت سے غرض ہوتی۔ صنعتوں کی چمنیوں سے دھواں نکلتا ہے ان کے لیے یہ بات کافی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے نزدیک کسی مزدور کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ناول نگار نے اسے ایک کردار سلیم کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کی۔ سلیم جو کہ دِق کا مریض تھا جب مزدور ہڑتال کر رہے تھے وہ چمنی سے دھواں جاری رکھنے کی کوشش کرتا رہا اور اسی دوران اس کی موت واقع ہو جاتی ہے مگر جب صنعت کار آتے ہیں، وہ دیکھتے ہیں کہ چمنی سے دھواں نکل رہا ہے تو اس پر وہ خوشی کا اظہار کرنے لگتے ہیں مگر جو اس وجہ سے اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا، اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتے کہ اس دھواں کی وجہ سے کسی کا گھر اجڑ گیا، اس کی ذمہ داری کس کی ہے؟

اداس نسلیں میں تحریکِ آزادی، مسلم لیگ کی سیاسی سرگرمیاں، کسانوں کا استحصال اور زمین داروں اور جاگیرداروں کے سیاسی رویوں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ ناول میں انگریزی سامراجیت اور ہندوستانی جاگیرداروں کے نچلے طبقے پر ظلم وستم اور استحصالی کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

ناول میں طبقاتی تفریق کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ ایک طبقہ غربت کی چکی میں پس رہا ہے جس میں نیاز بیگ کا خاندان شامل ہے تو دوسری طرف روشن آغا جیسا جاگیر دار ہے یہاں ایک اور طبقاتی امتیاز کا بھی احساس ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور جو انگریزوں کے وفادار ہیں، انھیں انگریزوں کی بالادستی حاصل ہوئی ہے۔

اداس نسلیں میں انگریز کے دورِ حکومت میں ہندوستانیوں کے مایوس کن حالات و واقعات بیان کیے ہیں۔ انگریزوں نے یہاں آکر جس طرح ہندوستانی عوام کا استحصال کیا، ناول نگار اس سے بہت مایوس ہوا اور یہ ناول انہی اداسیوں کا مجموعہ ہے۔ ناول نگار نے ناول میں پہلی جنگِ عظیم سے لے کر قیامِ پاکستان تک انگریزوں کی سازشوں، مکاریوں اور برصغیر کے لوگوں کے معاشی مسائل اور ان کے استحصال کو پیش کیا ہے۔ اداس نسلیں میں جاگیر داروں اور زمین داروں کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے:

> تم نے میرے باپ کو کھیتوں میں کام کرتے ہوئے دیکھا ہے؟ یا اپنے باپ کو؟ ان کی انگلیاں ٹیڑھی ہو گئی ہیں اور پیٹھ کی کھال دھوپ میں جل گئی ہے اور آنکھوں میں پسینہ بہہ بہہ کر وہ اندھے ہو گئے ہیں اور ان پر اتنا قرض ہے کہ سات پشتیں ادا نہیں کر سکتیں اور تم نے مالکوں کے مکان دیکھے ہیں اور زمین اور مویشی؟ اور جتنا دودھ روزانہ ان کے گھر میں جاتا ہے اتنا تم نے ساری عمر میں بھی پیا ہے؟[۱۵]

تاج برطانیہ نے جب تقسیم ہند کا اعلان کیا۔ تقسیم کا اعلان ہوتے ہی جھگڑے اور فسادات شروع ہو گئے۔ انگریزوں کے خون کا ایک قطرہ بھی نہیں بہا مگر غلاموں نے ایک دوسرے کے پورے کے پورے گھر تباہ کر دیے۔ عورتوں کی عزتوں کو لوٹا گیا، بے گناہ لوگوں کو قتل کیا گیا۔ انہی فسادات کے حوالے سے عبد اللہ حسین لکھتے ہیں کہ:

> چند روز کے بعد فسادات زور پکڑ گئے اور لوگ شہر چھوڑنے لگے، ریل گاڑیاں کم پڑ گئیں تو جان بچا کر بھاگنے والوں کے قافلوں کے قافلے پیدل چل پڑے۔ ملک کے تمام حصوں سے فسادات اور لوگوں کے بھاگنے کی خبریں موصول ہو رہی تھیں۔[۱۶]

ان ظلم و ستم کے ساتھ ساتھ ایک تکلیف دہ چیز ہجرت تھی کہ جو لوگ صدیوں سے جہاں آباد تھے جہاں اُن کے باپ دادا، ان کی نسلیں رہتی تھیں اچانک اور زبردستی ہجرت کرنے کا حکم دے دیا گیا اور دوران ہجرت انہیں لوٹا گیا، مارا گیا اور ان کی عزتوں کو پامال کیا گیا۔

ناول میں جنگِ آزادی کے بعد کی صورت حال کا تجزیہ کیا گیا کہ کس طرح جنگِ آزادی کے بعد انگریز ہندوستانیوں پر برس پڑے اور انھیں مشکلات سے دوچار کر دیا۔ ناول میں اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اس معاشرتی استحصالی کے باعث نوجوان اپنا مستقبل تباہ کر چکے ہیں۔ اس استحصالی کو ختم کرنے کے لیے سماجی انصاف

کی تجویز بھی دی گئی۔ مجموعی طور پر یہ ناول بیک وقت سیاسی، سماجی، معاشرتی، نفسیاتی اور تاریخی ناول ہے۔ اس میں معاشرتی اور سماجی حقائق کو بہت احسن طریقے سے بے نقاب کیا گیا ہے۔

لندن کی ایک رات (۱۹۳۵ء):

سجاد ظہیر کا ناول لندن کی ایک رات بنیادی طور پر مربوط پلاٹ کے بجائے کئی کرداروں پر مشتمل ناول ہے۔ اس میں ایک کردار نمودار ہوا۔ اس کے مطابق ماحول بنا اور باقی کرداروں نے بھی اسی ماحول میں ایکٹ کیا۔ چنانچہ سجاد ظہیر نے اردو ناول میں پہلی مرتبہ پلاٹ کے بجائے کرداروں کو مرکزیت بنا کر کہانی کو آگے بڑھایا۔

> یہ ناول فنی اعتبار سے چوں کہ ناول نگاری کے مروج طریقوں یعنی واقعہ یا واقعات کی پیش کش میں کردار اور فضا نگاری، کرداروں کا ارتقائی سفر، قصے کا زینہ بہ زینہ ارتفاع اور پھر اینٹی کلائمکس سے گزر کر اختتام کو پہنچنے کی تکنیک کا پابند نہیں۔ اس لیے اس کی کوئی مربوط کہانی نہیں بلکہ مختلف کرداروں کے سوچنے، باتیں کرنے اور منصوبے بنانے کے عمل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے۔[۱۷]

ناول میں کوئی نقطۂ عروج نہیں اور نہ ہی کوئی واضح کہانی پیش کی گئی ہے۔ ناول چھ الگ الگ کرداروں پر مشتمل ہے۔ ناول میں ایک کردار کہانی بناتا ہے تو اسی کہانی کے ساتھ دوسری کہانی جڑ جاتی ہے۔ جتنے کردار ہیں اتنی ہی کہانیاں ہیں اور ہر کہانی اپنے ماحول کے مطابق پروان چڑھتی ہے اور پھر ختم ہو جاتی ہے۔ اس ناول کا قاری بے خبر رہتا ہے کہ کہانی میں اب آگے کون سا موڑ آنے والا ہے۔

ناول کے سبھی کردار متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور ہندوستان سے برطانیہ تعلیم حاصل کرنے جاتے ہیں اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہندوستانی عوام پر حکمرانی کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہندوستانی برطانیہ جا کے کس طرح خود کو اس ماحول میں ڈھالتے ہیں؟ وہاں کے لوگوں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ وہ لوگ انھیں کس نظریے سے دیکھتے ہیں؟ ان لوگوں کا ان کے ساتھ کیا رویہ ہوتا ہے؟ ان میں لبرل بھی موجود ہیں، مذہبی ذہنیت رکھنے والے بھی موجود ہیں اور نام نہاد وطن پرست نوجوان بھی شامل ہیں۔ ان کرداروں کے حوالے سے عتیق احمد لکھتے ہیں کہ:

> اعظم جیسا کردار جو اپنی دنیا میں آپ مگن ہے، اس کی پسند بھی گوری چمڑی ہے، عارف جیسا موقع پرست ہے جس انگریز لڑکی سے اس کا واسطہ پڑتا ہے، اس کے ساتھ شب بستری کی کوشش بھی کرتا ہے، نعیم جیسا فربہ اور کاہل مگر مجلسی زندگی کا دلدادہ کردار بھی ہے جو اس انگریز لڑکی پر ریجھ جاتا ہے جو اس کے ساتھ دو منٹ ہمدردانہ فہم کے ساتھ گفتگو کرنے لگتی ہے۔ دوسری طرف راؤ جیسا حقیقت پسند معاملہ فہم مگر بے عمل کردار ہے جسے ہندوستانیوں کی کم عقلی، ناعاقبت اندیشی اور آپسی رقابتوں سے بڑی چڑ ہے۔۔۔ راؤ کو ہندوستانیوں کی غربت، جہالت اوہام

پرستی اور حسد و رقابت کی فہم ضرور ہے لیکن اس صورت حال سے متصادم ہونے اور ایک نئی منزل کے سراغ کی اس کے پاس کوئی کلید ہے نہ اسٹریجٹی۔ [۱۸]

ناول کے کرداروں کالندن سے تعلیم حاصل کرنے کا مقصد یہ ہی تھا کہ اس زہر بھرے نو آبادیاتی نظام کے زیرِ سایہ ہندوستان میں ہم اپنا کوئی مقام بنا سکیں۔ کیوں کہ یہ نو آبادیاتی نظام کو کسی بھی صورت ماننے کو تیار نہیں تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ غربت سے انھیں چھٹکارا حاصل ہو جائے اور ان کا شمار بھی ان لوگوں میں ہو جائے جو انگریزوں کے نزدیک ہیں۔ ان کے بیچ جو بحث و مباحثہ ہوتا تھا اس کی کوئی عملی شکل نہیں تھی۔ حالاں کہ لندن میں ترقی پسندوں، مزدوروں اور لبرل لوگوں کی تنظیمیں موجود تھیں مگر ان میں سے کوئی بھی ان کا حصہ نہ تھا۔ یہ لوگ بس ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر بحث و مباحثہ کر لیتے تھے۔ ان کے دلوں میں آزادی کی خواہش تھی کیوں کہ انگریز ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے تھے جس وجہ سے انھیں غصہ بھی آتا تھا اور یہ چاہتے تھے کہ انھیں آزادی حاصل ہو مگر اس کے لیے وہ عملاً کوئی اقدامات نہیں کرتے تھے۔

سیاسی و سماجی شعور رکھتے ہوئے یہ نوجوان شراب و شباب میں گھرے ہوئے ہیں جو نو آبادیاتی تمدن کا خاصا ہے۔ نو آبادیاتی تمدن کا ان پڑھے لکھے لوگوں پہ ایسا اثر پڑا کہ یہ لوگ حسیاتی لذتوں میں بھی ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ملک ہندوستان کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں غلامی سے نجات دلانا چاہتے ہیں مگر اس کے لیے کوئی عملی اقدامات نہیں کرتے۔ اس کے لیے خود کو کسی مصیبت میں نہیں ڈالتے۔ یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ہم وطن کوئی تبدیلی لائیں گے، انھی سے امیدیں لگائے بیٹھے ہیں مگر دوسری طرف ہندوستان میں لوگ ان کی طرف نظریں جمائے بیٹھے ہیں کہ کب یہ آئیں گے اور ہمیں یہ نوجوان پڑھا لکھا طبقہ سکھائے گا کہ کیسے انگریزوں سے جان چھڑوائی جا سکتی ہے۔

نو آبادیاتی تمدن میں جبر اور خوف کی ایسی فضا قائم کی جاتی ہے کہ لوگ حالات کا مقابلہ کرنے کے بجائے نو آبادیات کا ساتھ دینے لگتے ہیں۔ ایسی ہی مثال "لندن کی ایک رات" میں عارف کی ہے جو آئی سی ایس کے لیے منتخب ہونا چاہتا ہے اور اس کی کیفیت کچھ یوں ہے:

اسے امید تھی کہ اس طرح سے نہ صرف اس کی انگریزی زبان کی مہارت بہتر ہو جائے گی بلکہ "ٹائمز" اخبار کے خیالات اس کے دماغ میں اچھی طرح سے جم جائیں گے۔ اس اخبار کا نقطۂ نظر انگلستان کے بڑے صاحبوں کا نقطہ نظر ہوتا ہے جو بات "ٹائمز" میں چھپ جائے اسے نیم سرکاری سمجھنا چاہیے۔ عارف چاہتا تھا کہ وہ سرکاری خیالات میں بالکل ڈوب جائے اور جب امتحان کا وقت آئے تو اس کے قلم سے اور اس کی زبان سے ایک حرف بھی ایسا نہ نکلے جس سے امپریلسٹ محقوں کو کسی قسم کا اختلاف ہو سکے۔ اوروں کی رائے کو اپنا بناتے بناتے اس کا دماغ

گراموفون کی طرح ہو گیا تھا لیکن اسے اس بات کا احساس بالکل نہیں تھا کہ جھوٹے نقلی سکے استعمال کرنے کی اس کو اتنی عادت ہو گئی تھی کہ وہ انھیں سچا سمجھنے لگا تھا۔[۱۹]

لندن کی ایک رات کا کردار نعیم نو آبادیاتی تمدن کی ایک عمدہ مثال ہے۔ وہ اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے لیے تقریر تو خوب کر لیتے ہیں مگر عمل کی قوت سے محروم ہیں۔ اور یہ ہی نو آبادیات کا خاصہ ہے کہ ان سے مزاحمت کی قوت چھین لیتی ہے مثلاً نعیم ایک ہمدرد کردار ہے وہ اپنے ساتھیوں کی مدد کرتا ہے مگر اس کی ہمدردی کا یہ جذبہ اس وقت بیدار نہیں ہوتا جب اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ انگریز حکمران اس کا اور اس کے ہم جنسوں کا استعمال کر رہے ہیں۔

نو آبادیاتی نظام طاقت ور گروہوں کو تقسیم کر دیتا ہے تا کہ وہ مزاحمت کے قابل نہ رہیں۔ جیسا کہ ہم نے ہندوستان میں دیکھا کہ انگریز حکومت سے پہلے وہ ہندوستان میں مقیم راجاؤں، جاگیرداروں کو آپس میں لڑا کر انھیں ایک دوسرے سے الگ کرتے اور بعد میں انہی پر حکومت کرتے تھے تا کہ کوئی مزاحمت کی کوشش بھی کرے تو ناکام ہو جائے۔

ان ناولوں کے علاوہ بھی ہمیں بہت سے نو آبادیاتی نظام پر لکھے گئے اردو ناول نظر آتے ہیں جن میں عزیز احمد کے ناول "گریز" اور "آگ"، اختر رضا سلیمی کا "جاگے ہیں خواب میں" کرشن چندر کا ناول "شکست"، عظیم بیگ چغتائی کا ناول "کالے گورے" شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کئی ایسے ناول بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جن کا موضوع مختلف ہوتا ہے مگر اس میں انگریزوں کے گھناؤنے چہروں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ http://www-collinsdictionary.com/dictionary/english

colonialism/ تاریخ ملاحظہ ۱۰ نومبر ۲۰۲۱ء بوقت ۱۰:۰۰ بجے۔

۲۔ انسائیکلوپیڈیا، *The New International Webster's comprehensive Dictionary of the English Language*، جلد ۱ (نیپلز: ٹرائیڈن ریفرنس پبلشنگ، ۲۰۰۶ء)۔

۳۔ *Penguin Dictionary of Literary Terms*، ص ۳۴۔

۴۔ ایڈورڈ سعید، ثقافت اور سامراج مترجم: یاسر جوا (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۰ء)، ص ۲۰۔

۵۔ ناصر عباس نیر، ''نوآبادیاتی صورت حال'' مشمولہ لسانیات اور تنقید (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۹ء)، ص ۲۴۔

۶۔ *The World Book of Encyclopedia* (امریکہ، ۱۹۹۸ء)، ص ۸۱۴۔

۷۔ اشفاق سلیم مرزا، مقالات تاریخ و فلسفہ (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۷ء)، ص ۶۴۔

۸۔ طاہر کامران، ''کولونیل ازم: نظریہ اور برصغیر پر اس کا اطلاق'' مشمولہ تاریخ، شمارہ ۲۲ (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۴ء)، ص ۴۲۔

۹۔ فینن فرانز، افتادگان خاک مترجمین: محمد پرویز، سجاد باقر رضوی (لاہور: نگارشات، ۱۹۹۶ء)، ص ۸۷۔

۱۰۔ مبارک علی، تاریخ اور تحقیق (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء)، ص ۲۱۲۔

۱۱۔ عبداللہ ملک، بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جدوجہد آزادی: ۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۷ء)، ص ۲۸۲۔

۱۲۔ مبارک علی، تاریخ اور تحقیق، ص ۶۳۔

۱۳۔ معین الدین عقیل، فتح نامہ ٹیپو سلطان (لاہور: گنج شکر پرنٹرز، ۱۹۹۹ء)، ص ۱۴۔

۱۴۔ وفا راشدی، بنگال میں اردو (دہلی، مطبوعہ اردو پبلشنگ ہاؤس، سن ندارد)، ص ۱۶۔

۱۵۔ انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان)، ص ۲۳۹۔

۱۶۔ ناصر عباس نیر، لسانیات اور تنقید (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۹ء)، ص ۳۳۔

۱۷۔ خواجہ زکریا، اکبر الہٰ آبادی : تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص ۶۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۶۵۔

۱۹۔ سر سید احمد خان، " اسباب بغاوت ہند" مشمولہ خیال نمبر، مرتبہ: ناصر کاظمی، انتظار حسین (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء)، ص ۵۶۔

۲۰۔ Hedi Bouraoui، *Albert Memmi by Judith Roumani,* *Research in African Literatures* (۱۹۸۹ء)، ص ۱۲۶۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۲۷۔

۲۲۔ *The Encyclopedia Americana* (Grolies Incorporated:USA، ۱۹۹۲ء)، ص ۵۰۵۔

۲۳۔ شمع افروز زیدی، اردو ناول میں طنز و مزاح (لاہور: پروگریسو بکس، ۱۹۹۸ء)، ص ۲۵۔

۲۴۔ محمد احسن فاروقی، نور الحسن ہاشمی، ناول کیا ہے؟ یعنی ناول نگاری کا تکنیک (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۴ء)، ص ۱۴۱۔

۲۵۔ ڈپٹی نذیر احمد، کلیات ڈپٹی نذیر احمد (لاہور: خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۵ء)، ص ۴۹۸۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۵۶۱۔

۲۷۔ ڈپٹی نذیر احمد، کلیات ڈپٹی نذیر احمد، ص ۶۵۶۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۵۶۱۔

۲۹۔ ڈپٹی نذیر احمد، ابن الوقت (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۷۳ء)، ص ۴۶۔۴۹۔

۳۰۔ پریم چند، گئودان (نئی دہلی: مکتبہ جامع لمیٹڈ، ۱۹۸۸ء)، ص ۳۶۰۔۳۶۱۔

۳۱۔ پریم چند، "گئودان" مشمولہ مجموعہ پریم چند (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص ۵۱۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۰۵۔

۳۳۔ سید عامر سہیل (مرتبہ)، عبد اللہ حسین ایک مطالعہ (لاہور: بیکن بکس، ۲۰۱۶ء)، ص ۸۷۔

۳۴۔ محمد خرم ثوانہ، اداس نسلیں کا سیاسی منظر نامہ مشمولہ عبد اللہ حسین ایک مطالعہ مرتبہ سید عامر سہیل (لاہور: بیکن بکس، ۲۰۱۶ء)، ص ۳۷۱۔

۳۵۔ عبداللہ حسین،اداس نسلیں (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء)،ص۱۸۰۔

۳۶۔ محمد عاصم بٹ، عبد اللہ حسین: شخصیت اور فن (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء)، ص۳۸۔

۳۷۔ عارف صدیق،" اداس نسلیں کا کردار مطالعہ نو آبادیاتی تناظر میں" مشمولہ عبد اللہ حسین ایک مطالعہ،مرتبہ: سید عامر سہیل(لاہور: بیکن بکس،۲۰۱۶ء)،ص۴۲۰۔

۳۸۔ عبداللہ حسین،اداس نسلیں،ص۴۴۵۔

۳۹۔ عتیق احمد،" لندن کی ایک رات: موضوع اور مواد"مشمولہ سجاد ظہیر: شخصیت اور فن و فکر (مرتبہ) (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)،ص۶۳۔

۴۰۔ عتیق احمد،"لندن کی ایک رات: ایک نو آبادیاتی مطالعہ" مشمولہ سجاد ظہیر: ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک،مرتبہ: گوپی چند نارنگ(لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)،ص۷۸۔

۴۱۔ سجاد ظہیر،لندن کی ایک رات (لاہور: نیا ادارہ،۱۹۷۴ء)،ص۷۴۔

باب دوم:

نولکھی کوٹھی کے کرداروں
کی فکر پر نو آبادیاتی اثرات کا جائزہ

باب دوم:

نولکھی کوٹھی کے کرداروں کی فکر پر نو آبادیاتی اثرات کا جائزہ

علی اکبر ناطق (تعارف):

علی اکبر ناطق ایک ناول نگار، افسانہ نگار اور شاعر ہیں۔ آپ کا خاندان فیروز پور، بھارت سے ۱۹۴۷ء کے فسادات کے بعد اوکاڑہ ہجرت کر آیا تھا۔ علی اکبر ناطق ۱۵ جون ۱۹۷۶ء کو اوکاڑہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام محمد بشیر اور والدہ کا نام حمیدہ بی بی ہے۔ آپ نے اوکاڑہ ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ایف۔ اے۔ کا امتحان گورنمنٹ کالج اوکاڑہ سے بی۔ اے۔ اور ایم۔ اے (پرائیویٹ) بہاؤالدین زکریا یونی ورسٹی سے کیا۔

علی اکبر ناطق کے خاندان کا تعلق مشرقی پنجاب سے تھا۔ تقسیم کے وقت ان کا خاندان ہجرت کر کے اوکاڑہ میں آباد ہو گیا۔ ان کے معاشی حالات ٹھیک نہیں تھے، والد مزدوری کرتے تھے۔ معاشی حالات خراب ہونے کے باعث ایف۔ اے کے بعد اپنی تعلیم پرائیویٹ طور پر حاصل کی اور اس کے ساتھ ساتھ محنت مزدوری کرتے رہے لیکن اسی دوران آپ نے نثر اور شاعری کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔

علی اکبر ناطق کی ۲۰۰۵ء میں رضیہ پروین سے شادی ہوئی۔ مزاج میں ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے علیحدگی ہو گئی۔ ان کی ایک بیٹی وجیہہ بتول ہے جو اپنی ماں کے پاس رہتی ہے۔ آپ ۲۰۱۷ء میں یونی ورسٹی آف لاہور میں بطور استاد وابستہ ہوئے۔ کچھ عرصے بعد یونی ورسٹی چھوڑ کر اوکاڑہ منتقل ہوئے اور پھر ستمبر ۲۰۲۰ء میں اسلام آباد منتقل ہو گئے۔ آج کل اسلام آباد میں مقیم ہیں جہاں وہ ایک کتب خانہ "مرزا غالب کتاب مرکز" چلا رہے ہیں۔

علی اکبر ناطق نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز بچپن میں ہی کر دیا تھا۔ انھیں تاریخ سے بہت لگاؤ تھا۔ انھوں نے اسلام اور دوسری تاریخی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ نثر میں فرحت اللہ بیگ، محمد حسین آزاد اور خواجہ حسن نظامی سے متاثر ہیں جب کہ شاعری میں میرؔ، غالبؔ، فیض احمد فیضؔ اور ناصر کاظمی کو پسند کرتے ہیں۔ علی اکبر ناطق نے ناول کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری اور شاعری بھی کی۔ ان کی تصانیف درج ذیل ہیں۔

۱۔ "بے یقین بستیوں میں" (نظمیں)

۲۔ "یاقوت کے ورق" (نظمیں)

۳۔ "نولکھی کوٹھی" (ناول)

۴۔ ''شاہ محمد کا ٹانگہ ''(افسانے)

۵۔ ''قائم دین'' (افسانے)

۶۔ ''فقیر بستی میں تھا'' (مولوی محمد حسین آزاد کی سوانح)

۷۔ ''سر منڈل کا راجہ''

۸۔ ''سبز بستیوں کے غزال ''

۹۔ ''در عدالت علے''

''بے یقین بستیوں میں'' اور ''قائم دین'' دونوں کو یوبی ایل ایوارڈ ملا۔ ان کے انگریزی تراجم بھی کیے گئے۔ ''یاقوت کے ورق'' پینگوئن انڈیا شائع کر چکا ہے اور ''نولکھی کوٹھی'' کا انگریزی ترجمہ پینگوئن انڈیا سے شائع ہو رہا ہے۔ ''یاقوت کے ورق'' کا انتساب اپنی بیوی اور بیٹی کے نام کیا۔ اپنی کتاب کے پیش لفظ میں کہتے ہیں کہ:

> میری نظر میں شعر کے معنی فطرت کی تصویریں ہیں جن کے نقش بولتے ہوں، رنگ حرکت کرتے ہوں اور پھر ان سے لمس اور ذائقے جنم لیتے ہوں۔[1]

علی اکبر ناطق ایک دلیر شاعر ہیں۔ ''بے یقین بستیوں میں'' جس کا دیباچہ شمس الرحمان فاروقی نے لکھا، میں ہم ایک جرأت مند اور بے خوف ذہن سے متعارف ہوتے ہیں جس کی تخلیقی قوتیں قابل رشک ہیں۔ ان کی نظموں کا اساطیری ماحول اور تاریخی شعور زمانہ حال کے ساتھ عمدگی سے پیوست کیا گیا ہے۔

علی اکبر ناطق ایک شاعر اور ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے افسانہ نگار بھی ہیں۔ ان کے افسانوں میں پنجاب کی زمین اور تہذیب سے غیر معمولی محبت پائی جاتی ہے۔ ناطق کے افسانوں میں اچھے افسانے کے تمام خصائص موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً ''والٹر کا دوست'' ایسا افسانہ ہے جس میں انھوں نے بڑی خوب صورتی سے ہندوستان کے مسلمانوں اور عیسائیوں کی نفسیات کے ساتھ ساتھ انگریزوں کی ایسی چال سے متعارف کروایا کہ قاری دنگ رہ جاتا ہے۔ اس افسانے کا موضوع طبقاتی تقسیم کے علاوہ حقیقت نگاری کی بھی عمدہ مثال ہے۔

ایک زمانہ تھا جب علامتی افسانے کو اہمیت حاصل تھی۔ جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ علامتی اظہار ایک مجبوری ہے۔ علی اکبر ناطق ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اس دور میں پوری قوت کے ساتھ تمام تر سیاسی، سماجی اور معاشی مضمرات کو پیشِ نظر رکھ کر کردار سازی کی ہے۔ مناظر بہت واضح ہیں اور افسانوں کے انجام قاری کو چونکا دیتے ہیں۔ علی اکبر ناطق کے افسانوں میں نئے دور کی نوید ہے۔ حقیقت نگاری کی ایک عمدہ مثال ہے۔

علی اکبر ناطق کو ادبی منظر نامے پر ابھرے ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا مگر دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے اپنا ایک مقام بنالیا ہے اور لوگوں کی توجہ اپنی طرف کروالی ہے۔ اپنے افسانوں کے بارے میں وہ اپنی کتاب کے پیش لفظ میں کہتے ہیں کہ:

> میں نے کسی بھی قسم کے فلسفے یا نظریے سے قطع نظر فقط حقیقی زندگی کی چلتی پھرتی تصویریں بنانے کی کوشش کی ہے۔[۲]

علی اکبر ناطق کے بارے میں ظفر سید کہتے ہیں کہ:

> علی اکبر ناطق اس تیزی سے ادبی افق پر طلوع ہوا ہے کہ اس نے آن کی آن میں اپنے سے پہلوں کے گویا سر کچل دیے ہیں۔ علی اکبر ناطق اس وقت کے اردو فکشن لکھنے والوں میں سب سے زیادہ مشہور اور اچھا لکھنے والا ادبی ستارہ ہے۔ وہ فکشن کی دنیا کے سعادت حسن منٹو اور پریم چند جیسے عظیم ادیبوں کی صف کا ادیب ہے بلکہ ناطق کی کہانیاں اور ناول قارئین کے درمیان روز گھومتی ہیں۔[۳]

علی اکبر ناطق اپنے کام کی وجہ سے دیکھتے ہی دیکھتے مقبولیت حاصل کرنے لگے۔ بہت کم وقت میں لوگوں کے دلوں میں جگہ بنالی۔ شمس الرحمان فاروقی ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ناطق کے لیے اب یہ حکم لگانا مشکل ہے کہ ان کی اگلی منزل کہاں تک جائے گی کہ ہر بار وہ پہلے سے زیادہ چونکا دیتے ہیں۔ ان کے تمام کام میں تازگی ہے، روایت اور تاریخ کا شعور حیرت زدہ کرنے والا ہے جس طرح ان کے شعر اور پھر فکشن میں کام ہے۔ اس سے پہلے ایسی روایت موجود نہیں ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں، افسانہ نگار بھی ہیں اور ناولسٹ بھی۔ ان کے فکشن میں پنجاب کی سرزمین میں غیر معمولی دلچسپی ان کے بیان میں غیر معمولی مہارت کا ثبوت دیتی ہے۔ ناطق کی نثر سے مکالمہ اور بیانیہ کے نامانوس گوشوں پر ان کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ناطق کے فکشن کا قاری خود انسان اور فطرت کے پیچیدہ رشتوں، انسان اور انسان کے درمیان محبت اور آویزش کے نکات سے بہرہ اندوز ہوتا ہوا دیکھ سکتا ہے۔ علی اکبر ناطق سے اردو ادب جتنی بھی توقعات اور امیدیں وابستہ کرے، نامناسب نہ ہوگا۔ ان کا سفر بہت طویل ہے۔ راہیں کشادہ اور منفعت سے بھری ہوئی ہیں۔[۴]

کردار نگاری:

لفظ ''کردار'' کسی بھی فرد کی چال چلن، عادات و حرکات اور اس کی سیرت کو جانچنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لغات میں کردار کے معنی کچھ اس طرح سے دیے گئے ہیں۔

فیروز اللغات کے مطابق:

کردار نگاری (ف۔ ا۔ مت) سیرت نگاری، اشخاص، قصہ کے احوال و اطوار کا بیان [۵]

کیمبرج ڈکشنری (*Cambridge Dictionary*) کے مطابق:

The Particular combination of qualities in a person or place that makes them different from others.[۶]

کولنز ڈکشنری (*Collins Dictionary*) میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ:

The Character of a person or place consists of all the qualities they have that make them distinct from other people or places.[۷]

افسانوی ادب میں کردار نگاری ایک لازمی جز ہے۔ چاہے اس کا تعلق داستان، ناول یا افسانے سے ہو۔ جہاں قصہ ہو گا وہیں کردار بھی دیکھنے کو ملیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ کردار واضح ہوں گے اور کچھ کردار مبہم ہوں گے۔

کہانی لکھنے اور سننے کا عمل ازل سے چلتا آرہا ہے۔ اس کے لیے پہلے داستانیں سنائی جاتی تھیں۔ داستانوں میں جو کردار ہوتے ہیں وہ مافوق الفطرت کارنامے سرانجام دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ آہستہ آہستہ ان کرداروں کو ہیرو بنایا گیا جن تک پہنچنا ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی، جیسا کہ شہزادیاں اور بادشاہ وغیرہ۔ پھر اس کا رجحان بھی کم ہونے لگا۔ پھر کہانی نویسوں نے ایسے کردار متعارف کروائے جن میں طاقت درندوں جیسے اور ذہانت انسانوں جیسی پائی جائے۔ مثال کے طور پر سر انسانی ہو اور باقی جسم کسی جانور کی طرح دکھتا ہو۔

ناول کی ابتدائی شکلیں داستانوں کی شکل میں فورٹ ولیم کالج سے رونما ہوئیں۔ فورٹ ولیم کالج میں کافی تعداد میں داستانیں لکھی گئی تھیں اور لکھنے والوں میں ہندو اور مسلم دونوں شامل تھے۔ ان میں حیدر بخش حیدری، رجب علی بیگ سرور، میر امن، مظہر علی والا جیسے لکھاری بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ اس وقت داستان گوئی نے ناول نگاری کی طرف قدم بڑھانے کا فریضہ سرانجام دیا۔

کردار نگاری ایک مشکل فن ہے کیوں کہ کہانی نگار کرداروں کے ذریعے قصہ گوئی اور واقعہ طرازی کو متاثر کرتا ہے۔ کرداروں کے ذریعے ہی کہانی شروع ہوتے ہوئے آگے بڑھتی ہے اور عروج و زوال سے ہوتی ہوئی اختتام تک پہنچتی ہے۔ ناول میں بنیادی اور ثانوی کردار پائے جاتے ہیں۔ عام طور پر ثانوی کردار بنیادی کردار کی فطرت اور اس کی شخصیت کو اجاگر کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ناول نگار کرداروں کے ذریعے ہی اپنی کہانی کے ارتقائی منازل طے کرتا ہے۔ اس لیے کردار نگاری ہنر مند اور باشعور ناول نگار کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔

قصے کو آگے بڑھانے کا دارومدار کرداروں کے ساتھ ساتھ مکالمے پر بھی ہوتا ہے۔ مصنف کرداروں کی ذہنی استعداد کو ایک دوسرے سے مختلف رکھتا ہے مثلاً پڑھے لکھے اور ان پڑھ کردار میں فرق ہوگا۔ ایک تعلیم یافتہ یا ایک بہتر ماحول میں پرورش پانے والا ایک ان پڑھ سے بہتر ہوگا۔

یوں تو افسانوی کردار انسانی کرداروں کی طرح ہوتے ہیں مگر ہو بہو ایک جیسے نہیں ہوتے۔ دونوں میں فرق ہوتا ہے۔ ہمارے انسانی کردار قصے کتابوں کے کرداروں سے تھوڑے مختلف دکھائی دیتے ہیں۔ لکھاری کے تخلیق کردہ کردار اصل انسانی کرداروں کے قریب ترین ضرور ہوتے ہیں جس طرح عام انسانوں کی عادات و اطوار ایک دوسرے سے مختلف پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح افسانوی کرداروں میں بھی یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ عمر، طبقے اور جنس کے لحاظ سے تمام کردار ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں۔

ناول نگار کو چاہیے کہ وہ ایسے کردار پیش کرے جو جیتے جاگتے کردار ہوں۔ قاری ان سے محبت یا نفرت کر کے کہانی کو ختم کرنے کے بعد بھی اس سے لطف اندوز ہوتا رہے اور اسے اپنی زندگی میں کہیں نہ کہیں سوچتا رہے۔ یہ کامیاب ناول کی نشانی ہے کہ ان کرداروں کی یاد قاری کے دل میں رہ جائے۔ ناول میں ناول نگار جن کرداروں کو پیش کرے، ان کرداروں کی اس وقت کی رسم و رواج، تہذیب و تمدن غرض اس مقام کی تمام خصوصیات کا حال ناول میں بیان کرے۔ اس سے ناول کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ناول نگار کرداروں کے ساتھ ہمدردی اور خلوص سے بھی پیش آتا ہے۔ کبھی وہ خود کرداروں سے متاثر ہوتا ہے تو کبھی کرداروں کو متاثر کرتا ہے۔ ناول نگار کرداروں کے ذریعے اپنے جذبات کو پیش کرتا ہے۔

> مصنف اپنی ذات کا کچھ حصہ جہاں کرداروں کے لیے وقف کرتا ہے۔ وہیں وہ خود بھی اپنے تخلیق کردہ کرداروں سے متاثر ہوتا ہے۔[۸]

ناول میں کردار نگاری کو فطری ہونا چاہیے جو کردار ناول میں دکھائے جاتے ہیں جو وہ فطری ہوں، جیتے جاگتے کردار ہوں یعنی وہ قاری کے لیے مافوق الفطری نہ ہوں تاکہ قاری انھیں سمجھ سکے اور اپنی سماجی زندگی سے اس کردار کو ہم آہنگ کرے اور دلچسپی لے۔ کرداروں کے فطری ہونے کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ اس کے عمل میں بھی فطری مناسبت پائی جائے۔ یہ کردار نگاری کے لیے ضروری سمجھنا چاہیے اور ایسا تب ہوگا جب کردار باعمل اور متحرک ہوگا۔ کرداروں کے ذریعے ناول نگار اپنے نصب العین اور اپنے نظریے لوگوں تک پیش کر رہا ہوتا ہے۔ اس لیے کرداروں میں ان صفات کا ہونا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو کردار نگاری بے روح اور بے جان ہوگی، جس سے وہ ناول نگار کے ہاتھوں کا کھلونا بن جائے گی اور قاری کی توجہ کا مرکز نہیں بن سکے گی۔ اس لیے ناول نگار کو چاہیے کہ وہ کرداروں کی ایسی صلاحیتوں کو اجاگر کرے جو حقیقی دنیا کے بالکل قریب ہوں اور قاری انھیں محسوس کر

سکے۔ کیوں کہ کرداروں کی زندگی عام نہیں بلکہ ایک ایسی زندگی ہوتی ہے جسے ناول نگار تخلیق کرتا ہے اور اسے ایسی زندگی دیتا ہے جو عام انسانوں کی طرح ہوتی ہے مگر ان سے زیادہ پُر اثر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر نجم الہدیٰ کردار نگاری کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> بیانیہ فقروں کی مدد سے یا صرف ان کے نام لکھ کر یا ان کی کسی خصوصیت کی جانب کسی عنوان سے اشارہ کر کے کردار متعارف کرائے جاتے ہیں، ان کی ظاہری و باطنی خصوصیات کا یا تو سرسری تذکرہ ہوتا ہے یا یہ خصوصیات کسی دوسرے پیرائے میں نمایاں کی جاتی ہیں۔ کرداروں کے اعمال و اقوال ان خصوصیات کی توثیق یا کچھ نئی خصوصیات کی نشان دہی کرتے ہیں، ان میں قابل فہم اور قرین قیاس اسواری بھی ہوتی ہے اور اس طرح کردار اپنے خال و خط سمیت ابھرتے ہیں۔ انہی بیانیہ فقروں، تعارفی لفظوں، ظاہری و باطنی خصوصیات کے اسی تذکرہ اور اعمال و اقوال کی انہی قابل فہم اور قرین قیاس جہتوں سے کردار نگاری کا فن عبارت ہے۔[9]

کردار نگاری میں واقعیت:

کردار نگاری میں واقعیت کا مفہوم صرف اتنا سا ہے کہ افسانوی دنیا کے قوانین کو مد نظر رکھتے ہوئے جو کردار تخلیق کیے جائیں وہ قابل یقین معلوم ہوں۔ افسانوی دنیا کے قوانین مختلف ہیں۔ یہ بات افسانوی ادب کی تمام صنفوں کے لیے ہے۔ اگر داستان کی بات کی جائے تو اس میں ہمیں نئی فضا اور ایک نئی دنیا دیکھنے کو ملتی ہے جو تخیل کی وجہ سے وجود میں آتی ہے تو اس طرح داستان میں قوانین کا مدار تخیل پر زیادہ ہوگا۔

کردار کو زندگی بخشنے کے سلسلے میں یہ بات ضروری ہے کہ ناول نگار کسی مؤرخ کی طرح کردار کے حالات و واقعات کو بیان نہیں کر دیتا بلکہ کردار کے تمام حالات کو اکٹھا کر کے اپنی قوت تخیل کے ذریعے ان میں نئی روح پھونک دیتا ہے۔ روز مرہ زندگی میں جن اشخاص سے ہمارا تعلق ہوتا ہے، ہم ان کے بارے میں سب کچھ نہیں جانتے اور نہ ہی وہ ہمیں سب بتاتے ہیں مگر ناول میں کرداروں کو ہم مکمل طور پر سمجھ اور جان سکتے ہیں۔ اگر ناول نگار کرداروں کو اچھے طریقے سے تخلیق یا پیش کرے تو ان کے کردار کا ہر پہلو ہم پر عیاں ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ناول نگار اپنے کرداروں کے چھوٹے چھوٹے پہلو ہمارے سامنے رکھ دے بلکہ اپنی قوت تخیلہ کے ذریعے کرداروں کی ان حرکات و سکنات اور صفات کو بیان کر دیتا ہے جس سے ان کی مکمل شخصیت کا خاکہ کھینچا جا سکتا ہے۔ انھیں چیزوں کا اظہار کر کے وہ اپنے کرداروں کو عام زندہ لوگوں سے زیادہ بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ کردار کی زندگی عام لوگوں کی زندگی نہیں ہوتی مگر ناول نگار اپنی تخلیقی قوت سے انھیں ایسی زندگی بخشتا ہے کہ وہ عام زندگی سے زیادہ پُر اثر ہو جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ناول میں کرداروں کی زندگی حقیقی زندگی سے مختلف ہوتی ہے۔ ناول نگار ایک الہامی کیفیت کے تحت ایک نیا م عالم تخلیق کرتا ہے۔ اس عالم میں جو افراد ہوتے ہیں وہ ہماری زندگی کے جتنے قریب ہوں گے اتنا ہی اچھا ہو گا مگر ان کا ہماری زندگی سے بالاتر ایک تخلیقی دنیا کا فرد ہونا ضروری ہے۔

ناول میں کرداروں کو عموماً دو طریقوں سے بیان کیا جاتا ہے۔ ایک طریقہ تشریحی جب کہ دوسرا ڈرامائی ہے۔ پہلے طریقے میں ناول نگار اپنے کردار کے جذبات، خیالات اور احساسات وغیرہ کو بیان کرتا ہے اور ان پر اپنی رائے دیتا ہے جب کہ دوسرے طریقے میں کردار اپنی بات اور اپنی حرکات سکنات سے خود کو متعارف کرواتا ہے۔ پہلی صورت میں ہمارا دھیان ناول نگار کی طرف ہوتا ہے اور دوسری صورت میں مجسم طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ہر ناول میں ان دونوں طریقوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ انیسویں صدی کے ناول نگار زیادہ تر پہلے طریقے کو ترجیح دیتے تھے مگر آج کل دوسرے طریقے کو زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔

کرداروں کی قابلیت، ان کے عمل ورد عمل اور ان میں جدوجہد کی بنا پر ان کی درجہ بندی کی جاتی ہے۔ ہر ناول میں کردار ہوتے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور نہ صرف کہانی کو لے کر چلتے ہیں بلکہ کہانی میں اتار چڑھاؤ اور رنگارنگی کا باعث ہوتے ہیں۔ کرداروں کی درج ذیل اقسام ہیں۔

۱۔ مرکزی کردار	۲۔ ثانوی کردار	۳۔ ضمنی کردار
۴۔ محرک کردار	۵۔ مرکب کردار	۶۔ محدود کردار
۷۔ مجہول کردار	۸۔ اُبھرے کردار	۹۔ ادھورے کردار
۱۰۔ سپاٹ کردار	۱۱۔ پیچیدہ کردار	۱۲۔ مکمل کردار
۱۳۔ غالب کردار	۱۴۔ عاجز کردار	۱۵۔ خاکسار کردار
۱۶۔ مکار کردار	۱۷۔ حساس کردار	

مرکزی کردار:

افسانوی دنیا میں کرداروں کو مختلف زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ کسی قصے کی ماجرا نگاری سے جس کردار کا بنیادی تعلق ہو اور جو شروع سے آخر تک اجزائے ماجرا پر حاوی رہے، اسے مرکزی کردار کہا جاتا ہے۔ باقی کرداروں کو جو مرکزی نہیں ہوتے انھیں ذیلی یا ضمنی کردار کہا جاتا ہے۔ ناول نگار مرکزی کردار کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ بعض طویل داستانوں میں مرکزی کرداروں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ بعض اوقات ایک ہی داستان میں کئی متوازی مرکزی کردار پائے جاتے ہیں۔ ایسا صرف داستانوں میں نہیں ہے بلکہ ناول میں بھی ہمیں متوازی مرکزی کردار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بعض قصے ایسے ہوتے ہیں جن میں مرکزی کردار ایک ہی ہوتا ہے۔ بالخصوص افسانوں میں ہمیں ایک ہی

مرکزی کردار ملتا ہے۔ مرکزی کرداروں کی زیادہ سے زیادہ تعداد متعین نہیں ہے۔ہاں مگر یہ ضروری ہے کہ وہ ذیلی کرداروں سے کم ہوں۔

ثانوی کردار:

ثانوی کردار مرکزی کرداروں کے اعمال میں ان کے ہمراہ نظر آتے ہیں۔ ثانوی کردار مرکزی کردار کے مقاصد کو نمایاں کرتے ہیں۔ یہ کردار کبھی کبھی پلاٹ کو ایک خاص مقام تک پہنچانے میں بھی معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ثانوی کرداروں کو عام نوعیت کا کردار سمجھیں گے تو یہ بالکل غلط ہے۔ کیوں کہ جب آپ ایک تحریر لکھتے ہیں اور اس میں کردار نگاری کرتے ہیں تو آپ کے لیے آپ کا ہر کردار ضروری اہمیت رکھتا ہے۔ ہر کردار چاہے وہ مرکزی کردار ہو یا ثانوی کردار، اس کی اپنی ایک کہانی ہونی چاہیے۔ ثانوی اور مرکزی کرداروں میں تفریق بھی نہایت ضروری ہے۔ جہاں یہ ضروری ہے کہ اپنے ثانوی کرداروں کو مضبوط بنائیں تو وہیں یہ بات بھی ضروری ہے کہ آپ کے ثانوی کردار آپ کے مرکزی کرداروں پر حاوی نہ ہو جائیں۔ مجموعی طور پر مرکزی کردار کو زیادہ پُرکشش اور دل چسپ انسان کے طور پر پیش کرنا چاہیے۔

ضمنی یا ذیلی کردار:

ضمنی یا ذیلی کرداروں کو قصہ نگار وہ اہمیت نہیں دیتا جو مرکزی کردار کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ کردار مرکزی کردار کو اور واضح بناتے ہیں۔ ان کا ارتقا اہم نہیں ہوتا بلکہ یہ مرکزی کردار کے ارتقا کے لیے اہم ہوتے ہیں۔ ذیلی کردار کہانی میں آتے ہیں اور اپنا کام کر کے چلے جاتے ہیں۔ اس قسم کے کردار ضمنی طور پر آتے ہیں اور کہانی میں موقع بہ موقع نظر آتے رہتے ہیں۔

مضحک کردار:

ناول میں دل چسپی کا سامان پیدا کرنے والے کرداروں کو مضحک کردار کہا جاتا ہے۔ ایسے کردار فن پارے میں لطف پیدا کرتے ہیں اور قاری کے لیے دل چسپی کا باعث بنتے ہیں۔ بسا اوقات مضحک کردار اپنے رویے سے مرکزی کردار کی حیثیت بھی اپنا لیتے ہیں۔

مرکب کردار:

دوہرا رویہ جس کردار میں پایا جاتا ہے اسے مرکب کردار کہا جاتا ہے۔ مرکب کردار کے یہ دونوں رویے متضاد ہوتے ہیں۔ ان میں ایک ہی وقت میں کئی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ تخلیق کار کے لیے ایسے کردار تخلیق کرنا مشکل فعل ہے۔

محدود کردار:

خاص موقعوں پر کچھ وقت کے لیے جو کردار سامنے آتے ہیں انھیں محدود کردار کہا جاتا ہے۔ یہ کسی خاص موقع پر ظاہر ہوتے ہیں اور پھر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے کرداروں کا دارومدار قصے یا پلاٹ پر ہوتا ہے۔ اسی لیے مختلف مناظر کے ساتھ کئی محدود کردار بھی لائے جاتے ہیں کیوں کہ ایک عدد محدود کردار سے ہم مختلف مناظر کی نمائندگی نہیں کر سکتے۔

مجہول کردار:

ایسے کردار جو اپنے عمل میں جھول رکھتے ہوں تو وہ اپنے عمل کی کمزوری کی وجہ سے مجہول کردار کہلائے جاتے ہیں۔ یہ کسی بھی مقصد کی تکمیل کے دوران ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ ایسے کردار کسی کے اکسانے کی وجہ سے ناول میں کچھ دیر کے لیے نظر تو آتے ہیں مگر پھر ختم ہو جاتے ہیں اور ان کرداروں میں اپنے وجود کا تاثر بھی نہیں رہتا۔

اکہرے کردار:

ایک ہی رویہ اختیار کیے رکھنے والے کرداروں کو اکہرے کردار کہا جاتا ہے جو ایک ہی انداز سے کام کرنا پسند کرتے ہیں۔ انہیں یک رخے کردار بھی کہا جاتا ہے۔

ادھورے کردار:

وہ کردار جن میں عقل و فہم جیسی خصوصیات کی پختگی نہ پائی جائے، انھیں ادھورے کردار کہا جاتا ہے۔ ایسے کردار اپنے عقل و فہم کی پختگی سے پہلے ہی اپنے عمل کو ختم کر دیتے ہیں۔ ایسے کرداروں کا تعلق زندگی کے ا دھورے پن سے منسلک ہوتا ہے۔

سپاٹ کردار:

ناول میں شروع سے آخر تک یکسانیت کے حامل کرداروں کو سپاٹ کردار کہا جاتا ہے جن میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ شروع سے آخر تک ایک ہی رویہ اختیار کیا ہوتا ہے۔ جذبات کے کسی ایک رویہ کو اپنا کر یہ اپنی شخصیت نمایاں کرتے ہیں۔ ان میں عمل کا تاثر ختم ہو جاتا ہے۔

پیچیدہ کردار:

ایسے کردار جو خود کو کسی پیچیدگی میں مبتلا رکھتے ہیں انھیں پیچیدہ کردار کہا جاتا ہے۔ یہ کردار آزادانہ زندگی اختیار کرتے ہیں۔ ایسے کردار خود کو جیسا ظاہر کرتے ہیں ویسے نہیں ہوتے۔ ان کی شخصیت میں پیچیدگی کا عنصر کار فرما ہوتا ہے۔

مکمل کردار:

ایسے کردار جو ذہنی، فطری اور شعوری طور پر سمجھ داری کا ثبوت دیں انھیں مکمل کردار کہا جاتا ہے۔ ایسے کرداروں میں تجربہ کاری کے ساتھ ساتھ یہ صلاحیت بھی موجود ہوتی ہے کہ اسے کس طرح اور کہاں استعمال کرتا ہے۔

غالب کردار:

اپنے حرکت و عمل کی وجہ سے دوسروں پر اثرانداز ہونے والے کرداروں کو غالب کردار کہا جاتا ہے۔ یہ کردار کسی سے بھی اپنی بات منوانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور لوگ ان سے متاثر ہوتے ہیں۔ اپنی صلاحیتوں سے وہ لوگوں کو متاثر کرتے ہیں اور وہ دل ہی دل میں ان جیسا بننے کی خواہش کرنے لگتے ہیں۔ ایسے کرداروں میں صرف بات منوانے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی بلکہ لوگوں پہ ان کا رعب بھی ہوتا ہے۔

عاجز کردار:

ایسے کردار جو عقل و فہم کی صلاحیتوں سے بھرپور ہوتے ہیں مگر کسی مجبوری یا بے بسی کی حالت میں نظر آتے ہیں انھیں عاجز کردار کہا جاتا ہے۔ ایسے کرداروں کے پاس عقل و فہم جیسی صلاحیتیں تو موجود ہوتی ہیں مگر پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح کے مسائل کا شکار ہوتے ہیں۔ انھیں ٹھیک وقت پر مواقع میسر نہیں ہوتے جس کی وجہ سے وہ عاجز یا بے بس ہو جاتے ہیں۔

خاکسار کردار:

ایسے کردار جو خود کو خدمت کرنے کے لیے وقف کر دیتے ہیں انھیں خاکسار کردار کہا جاتا ہے۔ یہ کردار کسی کے تابع نہیں ہوتے بلکہ آزادانہ زندگی گزارنے کے قائل ہوتے ہیں۔ ایسے کردار خود دار ہوتے ہیں اور اپنے عمل اور اپنی صلاحیتوں سے لوگوں کو اپنا دل دادہ بنا لینے کا ہنر رکھتے ہیں۔

مکار کردار:

ایسے کردار جو جھوٹ، فریب اور دھوکے سے کام لیتے ہیں انھیں مکار کردار کہا جاتا ہے۔ وہ اپنے مفاد کے لیے کسی کا بھی حق مارنے سے ریز نہیں کرتے اور اس کے بعد انھیں کوئی پچھتاوا نہیں ہوتا۔ مکار کردار زندگی کے ہر موقعے پر جھوٹ اور فریب کا سہارا لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اوروں کا حق مارنا وہ جائز سمجھتے ہیں یا خود کو اس بات کی یقین دہانی کراتے ہیں کہ انھوں نے اپنے حق کے لیے یہ سب کیا ہے۔

حساس کردار:

جن کرداروں میں جذبات کی شدت پائی جاتی ہے انھیں حساس کردار کہا جاتا ہے۔ خوشی اور غم میں وہ دوسروں سے زیادہ جذباتی دکھائی دیتے ہیں۔ دوسرے لوگوں سے زیادہ وہ جذبات کو محسوس کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی زندگی میں خراب نتائج بھی رونما ہوتے ہیں۔ کیوں کہ احساس کا حد میں ہونا خوبی جب کہ حد سے تجاوز کرنا کردار کی خامیوں میں شامل ہوتا ہے۔

نولکھی کوٹھی کے کردار

نوآبادیات میں جہاں مغلوب قوم کا استحصال کیا جاتا ہے، ان کے حقوق پر ڈاکا ڈالا جاتا ہے اور ان کے وسائل کو اپنے معاشی مفاد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے وہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں نوآبادیاتی نظام میں فائدہ پہنچ رہا ہوتا ہے۔ اس کا آغاز مغل بادشاہوں کی حکومت کا زوال ہے۔ جب بہادر شاہ ظفر کو کٹھ پتلی بنا کر تخت پر بٹھا دیا گیا تھا اور ہندوستان کے تمام تر فیصلے انگریز کیا کرتے تھے۔ اس وقت جو غدار تھے انھیں انگریزوں نے بہت سی مراعات دیں۔ جائیدادیں اور زمینوں سے انھیں مالا مال کر دیا تاکہ وہ انگریزوں کے ارادوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ان کی مدد کر سکیں۔ اس طرح انھیں لالچ دے کر اپنے ساتھ شامل کر لیا اور مقصد پورا ہونے کے بعد انھیں دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا۔ اس کی زندہ مثال ناول ابن الوقت ہے۔ جب وہاں کے لوگوں کو سہولیات میسر کی جاتی ہیں وہ انگریزوں کا ساتھ دیں اور جب انگریزوں کو مناسب لگتا ہے وہ انھیں خود سے جدا کر دیتے ہیں۔ ناول "نولکھی کوٹھی" میں نوآبادیاتی نظام میں جہاں کرداروں کے حقوق کا استحصال ہوا ہے۔ وہاں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو انگریزوں سے مستفید ہوا اور خوب مراعات حاصل کیں۔ یہ کردار پہلے اپنے گھر میں دو وقت کی روٹی بھی گاؤں سے مانگ مانگ کر لاتا تھا مگر انگریز سرکار نے اپنے مفاد کے لیے اسے سرکاری نوکری دی اور جب محسوس کیا کہ وہ ان کے لیے منافع بخش ثابت ہو رہا ہے تو اسے رہنے کے لیے گھر بھی دیا۔ جس کے بعد یہ کردار انگریزوں کا دیوانہ ہو گیا۔ یہ کردار ہے مولوی کرامت علی کا، جسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ یہ انگریز اس ملک کے وسائل لوٹ رہے ہیں۔ اسے صرف اس بات سے غرض تھی کہ ان کی بدولت اسے سرکاری نوکری اور گھر ملا۔ انگریز اس کے لیے فرشتہ بن چکے تھے۔ اب ہم نوآبادیاتی تناظر میں ناول کے کرداروں کا مطالعہ کریں گے۔

ولیم:

ولیم ناول کا مرکزی کردار ہے۔ وہ ایک انگریز ہے۔ ولیم کے باپ دادا نے ہندوستان پہ حکومت کی اور ولیم بھی بچپن سے ہندوستان میں رہا۔ کچھ عرصے کے لیے تعلیم حاصل کرنے انگلستان چلا گیا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہندوستان آکر بطور اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہوا اور اپنے باپ دادا کی طرح وہ بھی ہندوستان پہ حکومت کرنے والوں میں شامل ہو گیا مگر ولیم کی طبیعت اس کے والدین سے مختلف تھی۔ بے شک وہ ہندوستان پر حکومت کر رہا تھا مگر کہیں نہ کہیں اس کے دل میں ہندوستان کی عوام کے لیے نرمی کے جذبات بھی چھپے ہوئے تھے۔ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھا کہ انگریز ہندوستانی عوام کا استحصال کر رہے ہیں۔ وہ ہندوستان کی زمین کو سرسبز و شاداب اور ہندوستانی عوام کو زندگی میں آگے بڑھتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ ولیم کی رگوں میں نواب انگریزوں کا خون دوڑ رہا تھا۔ خود کو نوابوں سے کم نہ سمجھتا اور ایک عالی شان زندگی گزار رہا تھا۔ جسمانی طور پر چاق و چوبند رہنے والا شخص تھا۔ کئی میل پیدل چلنا اس کے لیے معمولی بات تھی۔ اس کے ملازم تھک جاتے مگر وہ چست رہتا۔ ولیم کے دل میں ہندوستانی عوام کے لیے ہمدردی تھی اور یہ ہمدردی اس کی مختلف حرکات و سکنات سے ظاہر ہوتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہندوستانی عوام کو کسی قسم کی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ جہاں وہ رہتا تھا اس کے آس پاس کے علاقے کو بہتر بنانے کے اقدامات کرتا رہتا۔ زمینیں سرسبز و شاداب ہوں، پانی کا نظام بہتر ہو، ان امور پر بحث کرتا تھا۔ جہاں وہ ہندوستانیوں کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتا وہاں وہ اس بات کو بھی ذہن میں رکھتا کہ وہ یہاں پر حکومت کر رہا ہے اور یہ لوگ اس کے غلام ہیں۔ اس لیے خود میں اور ان میں فرق رکھتا تھا۔ اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ یہاں اس کا کیا مقام ہے۔ بطور اسسٹنٹ کمشنر اس نے ہندوستانیوں کی مدد کی مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے مقاصد کو نہ بھولا جو اس کے آباؤ اجداد پورا کرنے آرہے تھے۔ ولیم کو ہندوستان سے بہت پیار تھا اور وہ ہندوستان کی کھلی وادیوں، زمینوں میں سکون ڈھونڈتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ہندوستان پر ہمیشہ حکومت کرے۔ ہندوستان کی سرزمین سے اسے محبت ہو گئی تھی۔ وہ کسی بھی قیمت پر ہندوستان کو اور اپنی "نولکھی کوٹھی" کو نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس کا اظہار وہ اپنی بیوی کیتھی سے ان الفاظ میں کرتا ہے۔

کیتھی، ولیم دوٹوک بولنے لگا، مجھے پورے ہندوستان سے کوئی لینا دینا نہیں، مجھے کسی سے کوئی مطلب نہیں۔ بس اس وقت جس جگہ تم اور میں کھڑے ہیں، مجھے اسی سے مطلب ہے۔ یہ جگہ، یہ خطہ، یہ نولکھی کوٹھی، یہ نہریں، یہ باغات اور نہروں کی پکی روشیں، کھیتوں میں اگتے ہوئے آلو، مکئی، گندم، گنا اور برسن کے ٹھنڈے ٹھنڈے لمس، ان باغات اور نہروں کے مضاف میں رہنے والے لوگ، ان کے معصوم، سادہ اور عزت و آبرو بخشنے والے چہرے، یہ میری

زندگی ہے۔ میں نے تمھیں پہلے کہا ہے، مجھے نہ کسی اور زمین سے غرض ہے، نہ میں نے کبھی دہلی، لکھنؤ یا کلکتے کو پسند کیا۔ حتیٰ کہ آگرے کا تاج محل اس نولکھی کوٹھی کے عوض حقارت سے ٹھکرا دوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ولیم کو ہندوستان کی سرزمین سے بہت محبت تھی مگر وہ جس غرض سے یہاں رہ رہا تھا اسے بھی سامنے رکھتا تھا۔ ان کے افسران اس بات کا احساس دلاتے رہتے تھے کہ وہ خود میں اور ان غلاموں میں فرق کو قائم رکھیں۔ اس بات کو ولیم بھی نظر انداز نہیں کرتا تھا اور ہندوستانیوں کو یہ احساس دلاتا رہتا تھا کہ وہ ہمارے غلام ہیں۔

متھرا میں جتنی بات پوچھتا ہوں مجھے اتنا ہی جواب چاہیے۔ ولیم نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ عہدے بانٹنا گورنمنٹ کا کام ہے۔ مقامیوں کو اس میں دخل نہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقامی لوگوں کو ہر موقع پر یہ باور کروایا جاتا کہ وہ ہمارے غلام ہیں اور ہم نے جو کہنا ہے وہی آپ نے کرنا ہے جیسے ولیم متھرا کو یہ احساس دلا رہا تھا کہ وہ خود سے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ جب تک ہمارا حکم نہ ہو۔

ولیم ہندوستانی عوام کی کچھ عادات سے بہت تنگ ہوتا تھا اور اسے اس بات پر شدید غصہ آجاتا تھا مگر وہ خود پر قابو پالیتا تھا اور برداشت کر لیتا تھا۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:

کچھ ہی دیر میں ولیم نے محسوس کیا کہ کام کرنے والے کچھ لوگوں کی نظر ان پر پڑ چکی ہے اور وہ اسے اپنا کام چھوڑ کر بغور دیکھنا شروع ہو گئے ہیں۔ ولیم کو یہ عادت بری لگی۔ خاص کر ہندوستانیوں کی چاہے وہ مسلمان ہوں یا سکھ، ان کی اس مشترکہ عادت سے اسے سخت نفرت تھی۔ وہ کسی بھی چیز کو عجوبے کی طرح دیکھنے کے عادی ہیں پھر اس کے بارے میں انتہائی بیہودہ اور غلط مگر حتمی تاویلیں کرنے کے ماہر بھی۔

ولیم ایک ایسا افسر تھا جو چاہتا تھا کہ ہندوستانی عوام پڑھے لکھے، معاشی طور پر ترقی حاصل کرے اور اس کے پیچھے ذاتی مفاد بھی تھا کہ اگر یہ لوگ ایسے ہی جاہل رہیں گے تو ہم زیادہ تر ترقی نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے انھیں کچھ حد تک ترقی کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ ہندوستان پر حکومت کرنے کی اصل وجہ ہندوستانی عوام کی جہالت ہے۔ اس حوالے سے وہ اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ:

مالیکم صاحب آپ مجھے بتائیے کہ اگر یہ قوم اتنی جاہل اور سادہ نہ ہوتی تو کیا ہم پندرہ بیس ہزار لوگ ان کروڑوں گدھوں پر حکومت کر سکتے تھے؟ ان کی یہی جہالت تو آپ کے لیے نعمت ثابت ہوئی۔

۱۹۴۷ء سے قبل ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ ان دونوں گروہوں کے جگہ جگہ جلسے اور مظاہرے ہونے لگے۔ اس وقت ولیم کو ڈپٹی کمشنر بنایا گیا مگر یہ عہدہ اس کے پاس زیادہ دیر نہ رہ سکا کیوں کہ حالات بہت تیزی

سے بدل رہے تھے۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے جلسے نکلتے تھے جن میں آزادی کی بات کی جاتی تھی اور ولیم کو ان سے بہت کوفت محسوس ہوتی تھی۔

ولیم کو بعض اوقات ان سے وحشت محسوس ہوتی۔ ولیم کو اس بات پر شدید غصہ آتا کہ ان کے بڑے اصل میں انگریزوں کو نکال کر اپنی حکومت چاہتے ہیں۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے اندیشے آنے شروع ہو جاتے۔ وہ سوچتا، کیا یہ ہندوستانی عوام اسے بھی نکال دیں گے؟

دیکھتے ہی دیکھتے انگریزوں کی حکومت ختم ہو گئی۔ وہ انگریز جو برسوں سے ہندوستان پر حکومت کرتے آرہے تھے وہ واپس جانے لگے۔ مگر ولیم کو ہندوستان سے بہت پیار تھا، وہ اسے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس کی بیوی کیتھی انگلستان جانے پر اصرار کرتی ہے مگر ولیم اسے بھی دوٹوک جواب دے دیتا ہے کہ:

میں برطانیہ جانے کے لیے تیار نہیں ہوں، نہ اس وقت تم سے زیادہ گفتگو کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں، تمھارے پاس وقت کم ہے، اپنا فیصلہ سنا سکتی ہو۔

اس کی بیوی بھی ہندوستان چھوڑ کر بچوں کے ساتھ واپس انگلستان چلی جاتی ہے مگر ولیم ہندوستان نہیں چھوڑتا۔ اسے نولکھی کوٹھی سے بے حد پیار تھا وہ خود کو اپنے خاندان میں بدبخت سمجھتا تھا کہ اس کے باپ دادا نے بہت ٹھاٹھ سے ہندوستان پر حکومت کی اور جب میں ڈپٹی کمشنر بنا تو ہماری حکومت ختم ہو گئی۔ ولیم کو ہندوستانیوں کی احسان فراموشی پر بہت غصہ آتا تھا۔

کبھی ہندوستانیوں کی بے وفائی اور احسان فراموشی پر غصہ آتا، جنھیں تعلیم دینے سے لے کر عقل سکھا کر جدید دور میں داخل تک صرف انگریز ہی کا کردار تھا۔ ورنہ یہ گنوار کے گنوار ہی رہتے۔ کل تک اجڈ اور جاہل آج بم دھماکے کر رہے تھے۔ جلسے جلوس نکال کر ایجی ٹیشن پھیلا رہے تھے اور انڈیا چھوڑ دو کے نعرے بلند کرتے تھے۔

ولیم کی بچپن سے لے کر اب تک تمام یادیں ہندوستان سے وابستہ تھیں۔ وہ یہاں سے نہیں جانا چاہتا تھا۔ ولیم کے بیوی بچے اسے چھوڑ کر واپس چلے گئے مگر پھر بھی ولیم نے ہندوستان نہ چھوڑا۔ بالآخر ولیم سے حکومتِ پاکستان نے اس کی "نولکھی کوٹھی" ضبط کر لی جو کہ اوکاڑہ میں تھی۔ اس کوٹھی کو وہ اپنا سب کچھ مانتا تھا۔ اس کے سوا وہاں اس کا کوئی اپنا نہ تھا مگر پھر بھی وہ واپس نہ گیا اور ایک بوسیدہ سے گھر میں رہنے لگا جہاں اس کا دوست یشلے رہا کرتا تھا۔ وقت گزرتا گیا ولیم بوڑھا ہوتا گیا۔ اس نے خود کو تندرست رکھا ہوا تھا مگر ایک حادثے میں بخار کی وجہ سے کمزور ہو گیا۔ اس کے بعد اپنی طبیعت بحال نہ کر سکا اور اسی گھر میں وفات پا گیا۔ جو کوٹھی اس کے باپ دادا کی تھی اور جس میں ولیم اپنی زندگی کے آخری ایام گزار رہا تھا وہاں سے نکال کر ایک پرانے اور بوسیدہ گھر میں منتقل کر دیا گیا جہاں وہ کچھ عرصے بعد انتقال کر گیا۔

غلام حیدر:

غلام حیدر فیروز پور کا رہنے والا تھا۔ شیر حیدر کا بیٹا تھا۔ شیر حیدر نے اپنے بیٹے کے گاؤں کے جھمیلوں سے دور رکھنا مناسب سمجھا۔ اسے پڑھنے کے لیے لاہور بھیج دیا۔ غلام حیدر نے لاہور سے تعلیم حاصل کی۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا بڑے بڑے جاگیرداروں، انگریزوں اور نوابوں کے ساتھ تھا جس کی وجہ سے اس میں تہذیبی رچاؤ تھا۔ ان لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے غلام حیدر ایک سرکش انسان بن گیا تھا اور اپنے گاؤں کے لوگوں سے مختلف نظر آتا تھا۔ غلام حیدر کو اس کے دوست نے لاہور میں رائفل دی تھی جو ہمیشہ اس کے کاندھے پر ہوتی تھی جس کی وجہ سے اس کا بہت رعب تھا۔ کیوں کہ اس وقت رائفل اور اسلحہ صرف انگریز حکومت کے پاس ہی نظر آتا تھا۔ اپنے باپ کے مرنے کے بعد تینوں گاؤں کی دیکھ بھال غلام حیدر نے کی اور اپنی رعایا کی ہر طرح سے حفاظت کرنے کی کوشش کی۔ سردار سودھا سنگھ سے دشمنی اسے وراثت میں ملی تھی۔ اس کے والد کی وفات کے اگلے دن ہی سودھا نے اس کے بندوں پر حملہ کر دیا تھا۔ غلام حیدر نے قانون کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر سودھا سنگھ ک سزا نہ ہوئی تو اس نے خود ہی بدلہ لینے کی ٹھان لی اور ایک مکمل منصوبے کے تحت اس کے ساتھیوں سمیت اس کا قتل کر ڈالا۔ سودھا سنگھ کو ایسا لگتا تھا کہ یہ کل کا لڑکا ہے، یہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا مگر اسی کے ہاتھوں اس کی جان چلی گئی۔

غلام حیدر نے سودھا سنگھ کو جوڑوں سے پکڑ کر سیدھا کیا اور کہا، سودھے مجھے پہچان، میں ہوں شیر حیدر کا بیٹا غلام حیدر، جس کی ملاقات کا تجھے بڑا شوق تھا اور جس کے بندوں کو تو نے ناجائز مار دیا۔ مجھے اپنے ہر سنگھ، جگبیرے اور دمے پر بڑا مان تھا۔ وہ دیکھ میں نے ان کی چھاتیاں کھول دی ہیں۔ کہاں گئے ان کی دیگی لوہے والی برچھیاں اور گنڈاسے؟ اب تو سمجھ لے، غلام حیدر نے اسی برگد کے نیچے تجھے سزائے موت سنا دی ہے۔ اب چل تو بھی انھی کے پاس مگر تیرا اور ان کا ٹھکانہ ایک جگہ پر نہیں ہو گا۔ سودھا سنگھ نے آنکھیں اوپر کر کے غلام حیدر کی طرف دیکھا جو موت کا فرشتہ بن کر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ غلام حیدر کا لمبے بُر والا لال رنگ کا لاچا، سفید کُرتہ اور سنہری تلے والا کُھسہ سودھا سنگھ کی آنکھوں میں تر بن کر لگا۔ غلام حیدر کی آنکھیں سرخ انگارا تھیں اور ان میں خون چڑھا ہوا تھا۔

جب ہندوستان میں مسلم لیگ اور کانگرس کے جلسوں کا آغاز ہوا اور دونوں گروہوں نے اپنی آزادی کا مطالبہ کیا۔ اس وقت غلام حیدر نے بھی اس میں حصہ لیا۔ چوں کہ وہ جانا مانا آدمی تھا اور اس کی بہادری کے قصے مشہور تھے۔ اس لیے اسے یقین تھا کہ رعایا اس کا ساتھ دے گی۔ جلسوں میں تقریریں کیں اور زیادہ سے زیادہ ووٹ مسلم لیگ کو دیے۔ اس کی تمام رعایا نے مسلم لیگ کو ووٹ دیے تقریر کرتے ہوئے اس نے عوام سے کہا:

یہ سب تمھارے ازلی دشمن ہیں۔ ان کی حکومت میں نہ تمھاری جان سلامت ہے، نہ تمھارے مال بچے۔ یہ سکھ، ہندو اور فرنگی کبھی تمھاری روزی روٹی کی حالت ٹھیک نہیں ہونے دیں گے۔ تم یاد رکھو، اسی صورت بچ سکتے ہو، اگر ان کو اپنے سے دور کر دو گے۔

اپنی رعایا کو جہاں بھی اس کی ضرورت پڑی اس نے ان کی مدد کی۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں اپنی رعایا کو بچاتے بچاتے اپنی جان دے دی مگر انھیں پُل پار کروا دیا اور خود شہید ہو گیا۔

غلام حیدر جب اپنی رعایا کے ساتھ پل پار کرنے کی جانب بڑھا تو وہاں حالات بہت گھمبیر تھے اور وہاں پہنچ کر انھیں معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے ساتھ وہ بے رحمی سے پیش آرہے تھے اور ہیڈ سلیمانکی پر مسلمانوں کو پندرہ بیس دنوں سے گورکھا فورس نے روکا ہوا تھا۔ وہاں پر بھی غلام حیدر نے ایڑی چوٹی کا زور لگانے کی کوشش کی اور اپنی رعایا کو پل پار کروانے کی کوشش میں لگ گیا۔ جب ہر کوئی صرف اپنے مفاد کو سامنے رکھے ہوئے تھا۔ غلام حیدر اس وقت بھی اپنی رعایا کی زندگیاں بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی تصویر ہمیں ناول میں ملتی ہے۔ جب غلام حیدر نے بھانپ لیا کہ یہاں ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا تو اس نے اپنی رعایا سے بات کی اور ان پر اپنی رائفلیں کھول دیں۔ غلام حیدر کے ساتھ اس کے ساتھی بھی شامل ہو گئے۔

غلام حیدر عین پل کے اوپر پہنچ چکا تھا اور مسلسل گولیاں چلا رہا تھا۔ میجر صاحب کے کیبن کو گولیوں کے دھماکوں سے آگ لگ کر، گھاس پھونس کو اس طرح جلا رہی تھی، جیسے چتا سے الاؤ اٹھ رہے ہوں۔ یہ حالت دیکھ کر میجر کیبن سے باہر کی طرف بھاگ اٹھا۔ انھی اوقات میں غلام حیدر نے تاک کر اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی جن میں سے دو گولیاں اس کے سر میں جا لگیں اور وہ وہیں لڑھک گئے، گورکھا سپاہیوں نے افسر کو یوں ڈھیر ہوتے دیکھا تو وہ بوکھلا گئے۔ اسی بوکھلاہٹ میں انھوں نے اندھا دھند فائرنگ برسا دی۔ اس دو طرفہ شدید فائرنگ میں دونوں طرف کے لڑنے والے اور دوسرے لوگ بیروں کی طرح گرنے لگے۔ چند ہی لمحوں میں غلام حیدر بھی گولیوں کی بارش میں اپنے ساتھیوں سمیت وہیں ہیڈ کے پل پر خون میں لت پت ہو گیا اور بارش کی رم جھم میں کچی سڑک پر منہ کے بل گر پڑا۔

غلام حیدر ایسا کردار ہے جو امن چاہتا ہے مگر جب اسے حکومت کی طرف سے انصاف نہیں ملتا تو وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ اپنی رعایا کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھتا ہے اور ہمیشہ ان کی مدد کرتا ہے۔ غلام حیدر کو انگریز سرکار بھی دیکھ کر ایک مرتبہ چونک جاتی ہے کہ ہندوستانیوں میں ایسی شخصیات بھی موجود ہیں جو غلامی نہیں کرتیں اور حق پر ڈٹی رہتی ہیں۔ غلام حیدر نے اپنے والد کے تمام فرائض پورے کیے۔ اپنے والد سے بڑھ کر اپنے

گاؤں والوں کی حفاظت کی۔ یہاں تک کہ تقسیم ہند کے وقت بھی گاؤں والوں کو اکٹھا کر کے ہجرت کرنے لگا اور ان کے حق کے لیے لڑتے لڑتے جان دے دی۔

سردار سودھا سنگھ:

سردار سودھا سنگھ جھنڈووالا کا رہنے والا تھا۔ شیر حیدر کا دشمن تھا۔ اگرچہ شیر حیدر سے زیادہ زمینیں اس کے پاس تھیں مگر شیر حیدر کا چرچا زیادہ تھا۔ سردار سودھا سنگھ اپنی رعایا پر بہت مہربان تھا، سخت مزاج تھا مگر اپنی رعایا کی مدد کرتا تھا۔ شیر حیدر کے مرنے کے بعد اس نے اپنی دشمنی شیر حیدر کے بیٹے غلام حیدر سے جاری رکھی۔ شیر حیدر کے مرنے کے ایک دن بعد ہی اس نے شیر حیدر کے بندوں اور اس کی زمین پر حملہ کروایا۔ جس کی وجہ سے ایک بندہ مر گیا۔ اس واردات کی بنا پر انگریز حکومت سردار سودھا سنگھ کے گھر آتی ہے تو اس کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں انگریز حکومت کا راج ہوتا ہے تو سردار سودھا سنگھ گھبرا جاتا ہے۔ سودھا سنگھ کے بندے بہت طاقت ور اور پہلوان تھے مگر حکومت کا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے ورنہ کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ سردار سودھا سنگھ کے گھر آکر اس سے تفتیش کرے۔

سودھا سنگھ سے بالواسطہ مخاطب ہونا اور بے پروائی سے پر نام کا جواب دینا ایسی گستاخی تھی جس نے اس کی طبیعت کو نہایت منغض کیا۔ اس نے سوچا سب قسمت کے کھیل ہیں ورنہ اس کی گوری چمڑی کے چھ فٹ بالکے کی کیا حیثیت تھی۔ ابھی زمین میں کلے کی طرح گاڑ کر ساتھ ڈاچی باندھ دیتا۔۔۔

سودھا سنگھ اگرچہ ایک طاقت ور آدمی تھا اور اس کا بہت رعب تھا مگر وہ لفظوں کے ہیر پھیر میں ماہر نہ تھا۔ جس طرح گاؤں کے لوگ سیدھے سادھے ہوتے ہیں اسی طرح سودھا سنگھ بھی تھا۔ جس کے پاس زمینیں جائیدادیں تو بہت تھی، دشمنی بھی نبھالیتا تھا مگر انگریزوں کے سامنے خوف زدہ ہو جاتا تھا اور ان کی باتوں کی وجہ سے سمجھ نہ پاتا تھا کہ کس وقت کیا جواب دیا جائے۔ ولیم جب اس کے گھر تفتیش کرنے آیا تو اس سے ایسے سوالات کر رہا تھا جس سے سودھا سنگھ کو ذہنی اذیت پہنچے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہو رہا تھا۔

سودھا سنگھ نے یہ سمجھ لیا کہ اب بات کھل کر کی جائے، جو ہونا ہے وہ تو ہو ہی جائے گا۔ کیوں کہ سرکار کو اس کے کرتوت کا پتہ چل گیا ہے۔ ایسے ہی تو یہ فرنگ چھوکرا او کھی او کھی باتیں نہیں کر رہا۔

سردار سودھا سنگھ خود کو ایک طاقت ور اور دلیر آدمی سمجھتا تھا۔ صبح سویرے اٹھ کر نہانا، عبادت کرنا اور باہر کھیتوں میں جا کر صبح کی سیر کرتا۔

رات بھر پڑنے والے پوہ کے پالے اور ٹھنڈی ہوا سے پانی کے اوپر برف کی کاغذی تہہ جم چکی تھی لیکن سردار سودھا سنگھ نے بچپن ہی سے گرم پانی اشنان کے لیے استعمال نہیں کیا تھا۔ اس کے خیال میں پانی گرم کر کے نہانا یا زنانیوں کا کام تھا۔ اس طرح کے لچھن کرنے سے سرداروں کی مردانگی میں فرق آتا تھا۔ سودھا سنگھ کی کمر اور پورے جسم پر ریچھ کی طرح بالوں کے اتنے گچھے اگے تھے کہ ماس کی ذرا بھی کرن نظر نہیں آتی تھی۔ ان کھردرے بالوں میں چھپے جسم کو نہلانے کے لیے سنت نے لسی کی بھری ہوئی گاگر رات کو ہی منگوالی تھی۔ یہ اس کا معمول تھا۔

سردار سودھا سنگھ کو اس کی بیوی بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ اس سے پیار بھری باتیں کرتا۔ جب غلام حیدر نے موقع پا کر سودھا سنگھ کو قتل کرنا چاہا تو اس وقت بھی اسے اس کی بیوی یاد آرہی تھی۔

جب سودھا سنگھ کو بچنے کا گمان نہ رہا تو اسے پھر بختو کی یاد آئی، اس نے آنکھیں بند کر لیں اور بینت کور کو دو ہتھڑ زور زور سے پیٹے اور بین کرتے دیکھنے لگا۔

رفیق پاؤلی:

رفیق پاؤلی شیر حیدر کا ملازم تھا۔ اس نے شیر حیدر کی پوری زندگی ملازمت کی۔ شیر حیدر کے نوے فیصد کام رفیق پاؤلی ہی دیکھتا تھا۔ رفیق پاؤلی ایک دیانت دار شخص تھا اور اس سے زیادہ بھروسے والا شخص شیر حیدر کو مل بھی نہیں سکتا تھا۔ رفیق پاؤلی شیر حیدر اور اس کے خاندان کے لیے جان نثار کرنے سے بھی پیچھے نہ ہٹتا۔ شیر حیدر کی وفات کے بعد رفیق پاؤلی غلام حیدر کے ساتھ رہنے لگا۔ پوری دلیری سے غلام حیدر کی حفاظت کرتا۔ غلام حیدر پر کوئی بات آتی تو رفیق پاؤلی تن من کی بازی لگا کر اس معاملے کو حل کرنے کی کوشش کرتا۔ جب غلام حیدر کے گاؤں پر سردار سودھا سنگھ نے حملہ کیا تھا اور پولیس غلام حیدر کی طرف آئی تو غلام حیدر انھیں کچھ نہ بولا مگر رفیق پاؤلی نے انگریز سرکار کو منھ توڑ جواب دیا:

تھانیدار صاحب، آپ نے کیا کرنا ہے؟ بس یہ دیکھیں کہ اگلا حملہ ہم پر کب ہوتا ہے۔ اس کے بعد پھر ایک وقوعے کا معائنہ کرنے آجانا۔ آپ کا کام ختم ہو جائے گا۔

اسے معلوم تھا کہ وہ انگریز سرکار پر طنز کر رہا ہے مگر یہ بات غلام حیدر کو اداس کیے ہوئے تھی جس کی وجہ سے رفیق پاؤلی تھانیدار پر طنز کرنے سے بھی باز نہ آیا مگر اس وقت ان کا نقصان ہوا تھا اس لیے تھانیدار نے بھی خاموشی سے سننا مناسب سمجھا۔

رفیق پاؤلی اس بات سے واقف تھا کہ غلام حیدر کو ان کاموں کا زیادہ تجربہ نہیں ہے اس لیے وہ پہلے سے زیادہ چاک و چوبند رہتا تھا۔ رفیق پاؤلی غلام حیدر کے حکم پر اپنے بندوں سمیت جودھاپور کے لوگوں کو بچانے گیا جن

پر سردار سودھا سنگھ کے بندوں نے حملہ کر دیا تھا۔
اتنا ہوا کہ رفیق پاؤلی کے آنے کی وجہ سے جودھاپور والوں کے حوصلے اور قوت میں اضافہ ہو گیا۔ اس لیے وہ پہلے سے زیادہ بہادری سے لڑنے لگے۔ ان کے اس طرح لڑنے سے سکھوں کے حوصلے اٹھ سے گئے۔ وہ جس عظیم فتح کا گمان لے کے جھنڈو والا سے آئے تھے، ادھر نہ جانے کہاں سے کاہنا سیوئے نے تاک کر ایک گولی ماری کہ سیدھی آکر رفیق پاؤلی کے دل پر لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔
یوں جودھاپور کے لوگوں کو بچاتے بچاتے رفیق پاؤلی نے اپنی جان دے دی۔

کیتھی:

کیتھی ولیم کی بیوی تھی، جو پہلے انگلستان میں رہتی تھی۔ شادی کے بعد وہ ہندوستان اپنے شوہر کے پاس آگئی۔ ولیم ہندوستانی رعایا پر بہت مہربان تھا۔ کیتھی بھی ولیم کی طرح نوکروں اور وہاں کی عوام کے ساتھ شفقت سے پیش آنے لگی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت میں بدلاؤ آنے لگا۔ اب اسے ولیم پر بھی غصہ آتا تھا کہ وہ دیسی لوگوں کو رعایت دیتا ہے اور نوکروں کی غلطیوں کو معاف کر دیتا ہے۔ اب یہاں کے لوگ کیتھی کو ان پڑھ، جاہل اور کام چور لگنے لگے۔ کیتھی کو اب ہندوستانی عوام سے نفرت ہونے لگ گئی، وہ کہتی یہ بد بخت اور نالائق لوگ ہیں۔
وہ اس بات کی سختی سے قائل ہو گئی کہ کالے ایک بدبخت، نالائق اور منحوس قوم ہیں۔ ان کے جسموں سے بدبو آتی ہے، نہاتے نہیں اور گوروں کے درمیان بیماریوں کا سبب بنتے ہیں۔ ان کو پیار سے نہیں ذلت اور رسوائی سے پیش آنا چاہیے۔
کیتھی کا شوہر دیکھنے میں خوب صورت تھا اور گورنمنٹ کا افسر بھی۔ کیتھی اپنی دوستوں کے سامنے اس لحاظ سے بہت سرخرو تھی۔ اس کی دوستیں بھی اسے ولیم کے ساتھ دیکھ کر جل بھن جاتی تھیں۔ یہ دیکھ کر کیتھی فخر محسوس کرتی اور ولیم کے ساتھ پہلے سے زیادہ لپٹ جاتی۔ جب ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت ختم ہونے لگی اور انگریز اپنے ملک واپس آنے لگے تب کیتھی نے بھی بھانپ لیا کہ ہمارا ٹھکانہ بدل چکا ہے۔ ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے مگر اس بات سے ولیم بہت پریشان رہتا تھا۔ کیتھی اسے سمجھانے کی کوشش کرتی مگر ولیم کسی بھی صورت ہندوستان کو چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہ تھا۔
ادھر وہ کچھ کہنے سے ڈر رہی تھی اور پریشان تھی کہ ولیم اتنا چڑچڑا کیوں ہو گیا ہے۔ آخر وہ ہمت کر کے دوبارہ بولی، ولیم آخر تم کیا چاہتے ہو؟ میں نے کئی بار تم سے پوچھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کون سی پریشانی ہے جس کی وجہ سے تم آج اس

قدر بلبلا اٹھے ہو؟ میں تمھاری بیوی ہوں۔

کیتھی چاہتی تھی کہ اس کا شوہر اس کے ساتھ واپس جائے مگر ولیم کسی صورت جانے کو تیار نہ تھا۔ بالآخر کیتھی نے ولیم کو ہندوستان میں ہی چھوڑ دیا اور خود بچوں کے ساتھ انگلستان آگئی۔ جانے سے پہلے بھی ولیم کو سمجھاتی رہی۔

ولیم، اگر تم اپنی حماقت پر قائم رہے، تو میں اپنے بچوں کو اس لا دینے والی زمین سے نکال کر لے جاؤں گی۔

اور کیتھی نے ایسا ہی کیا۔ اپنے بچوں سمیت واپس چلی گئی، پھر کبھی مڑ کر ولیم کی خبر نہ لی۔

جانسن صاحب:

جانا سن صاحب ڈپٹی کمشنر تھے جو ولیم کے والد تھے۔ جانسن صاحب ہندوستان میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ نوابوں سے کسی بھی طرح کم نہ تھے۔ اگر کسی انگریز افسر کو ان سے حسد اور نقصان کا اندیشہ ہوتا تو یہ اتنے چالاک تھے کہ انھیں مہنگے مہنگے تحائف دیتے تھے کہ ان کا مروتاً خاموش رہنا پڑتا۔ انگریز حکمرانوں کے مقابلے میں جانسن صاحب ہندوستان کی عوام کا زیادہ خیال رکھتے مگر آخر کار وہ خود بھی ایک انگریز تھے تو وہ بھی یہ ہی سوچتے تھے کہ یہ ہم سے بدتر قوم ہے۔ وہ اپنے بیٹے ولیم کو بھی اس بات کی تاکید کرتے ہوئے کہتے تھے کہ:

تمھیں معلوم ہونا چاہیئے، کالے اور سفید کے درمیان ایک لکیر ہے۔ اسے جب بھی عبور کیا جائے گا، اسی وقت یہ زمین اپنے گلے سے ہمارے اقتدار کی رسی کاٹ دے گی۔ میں بھی اس حق میں ہوں کہ کالوں کی غربت اور جہالت ختم ہونی چاہیئے۔ اسے بہت حد تک ہم نے ختم بھی کیا ہے لیکن آپ کیا اس بات کو بھول گئے کہ ہماری ان پر حکومت کا سبب ان کی یہی جہالت ہے۔ چناں چہ اسے ایک حد تک ان پر مسلط رکھنا ضروری ہے۔

جانسن صاحب بھی ہندوستان کو ایک نچلے درجے کی جاہل قوم سمجھتے تھے جیسا کہ نو آبادیات میں غالب قوم، محکوم قوم کو سمجھتی ہے۔ اسی طرح انگریزوں نے بھی ہندوستان پر اپنا تسلط قائم رکھا اور خود ایک برتر جب کہ ہندوستان کو ایک نچلے درجے کی قوم کہلاتے رہے۔ وہ اپنے بیٹے کو بھی اسی بات کی نصیحت کرتے کہ ہندوستانی قوم کی مدد کرو، ان کی جہالت بھی اگر کسی حد تک ختم کر سکتے ہو تو کرو، مگر ان پر اتنی محنت نہ کرو کہ یہ پڑھ لکھ کر اتنے باشعور ہو جائیں کہ ہمیں ہندوستان چھوڑنے پر مجبور نہ کر دیں۔ ولیم کو سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہم کچھ کام میں آزاد ہیں اور کچھ میں مجبور۔ یہ فارم اور یہاں جگہ جگہ ہماری نشانیاں، جو ہم نے اس زمین پر ثبت کی ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے نام پر برقرار رہیں۔ حالات کے فیصلے ضروری نہیں ہمارے فیصلوں سے اتفاق کریں مگر ہم اپنی کوشش جاری رکھ سکتے ہیں۔ اگر ہم خود اپنے پاؤں کاٹنا شروع کر دیں، جیسا کہ آپ کی طرح انسانیت کا درد رکھنے والے کئی انگریز افسر کر رہے ہیں تو ہمیں اپنی قسمتوں پر شکوہ نہیں کرنا چاہیئے۔ مجھے آپ کے متعلق کمشنر ہاؤس سے

کچھ شکایات وصول ہوئی ہیں جو بہت خطرناک ہیں۔ اپنے پیروں کی زمین دیکھ کر قدم اٹھاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ اگلے قدم پر زمین ختم ہو جائے۔

انھیں معلوم تھا کہ ہندوستانی عوام کے ساتھ کیسا سلوک رکھنا ہے۔ وہ خود میں اور ہندوستانیوں میں بنائے گئے فرق کو کہیں بھی ختم نہیں کرتے تھے اور ہندوستان کی سرزمین سے بھرپور فائدہ اٹھاتے رہتے۔

ہیلے:

ہیلے ایک ڈپٹی کمشنر انگریز تھا جو ایک بارعب اور نہایت چالاک انسان تھا۔ ہیلے ہندوستانی عوام کے سامنے خود کو اس طرح ظاہر کرتا تھا کہ وہ ان کا مددگار ہے مگر پس پشت وہ اپنی حکومت کے مقاصد کو مد نظر رکھتا تھا۔ نوآبادیاتی نظام میں ایک حاکم جس طرح سوچتا ہے، ہیلے بھی بالکل ویسا ہی تھا۔ وہ ہمیشہ یہ ذہن میں رکھتا تھا کہ ہم یہاں حکومت کرنے آئے ہیں، ہمارا وجود برتر سطح پر ہے۔ ہم حاکم ہیں اور ہندوستان محکوم ہے۔ ہم میں اور ان میں فاصلہ برقرار رہنا چاہیے۔ ہیلے ولیم کو کہتا ہے کہ:

ولیم تم ایک انگریز ہو، یہاں تمھاری حیثیت حاکم کی ہے۔ ہم یہاں کی زمین سے رومانس نہیں، حکومت کرنے آئے ہیں۔

اسی حوالے سے پھر ولیم سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ:

تمھارے ہیٹ کی چوڑائی پگڑی سے زیادہ ہونی چاہیے اور سگار کا دھواں حقے سے تلخ۔ تم ان کی آنکھوں میں دھواں بھرتے رہو تاکہ یہ صاف نہ دیکھ پائیں۔ اس کے بعد جو تمھاری عینک انھیں دکھائے، یہ وہی دیکھیں لیکن دھواں تمھاری آنکھوں کی طرف نہیں آنا چاہیے۔

ہیلے انگریز برطانیہ سول سروس کے سامنے احساس کمتری کا شکار بھی تھا اور اسی دوران وہ عجیب و غریب حرکتیں کرتا۔ جیسے بہت زیادہ نصیحتیں کرتا اور غیر ضروری ہدایات کا بے وقت اظہار کرتا مگر ان باتوں کے علاوہ وہ ہندوستان پر اپنا تسلط ہمیشہ قائم رکھنا چاہتا تھا اور اس سے متعلق ولیم کو خبردار بھی کرتا رہتا اور اس کے ساتھ ساتھ انگلستان کی محبت بھی دل میں جگاتا رہتا۔

ولیم تمھیں انگلستان کی برف ہندوستان کے گرم دریاؤں سے اور لندن کے سفید کوے آگرہ کے کبوتروں سے زیادہ عزیز ہونے چاہیے۔

ہیلے اس بات کو ہمیشہ مد نظر رکھتا کہ ہمیں ہندوستانی زمین سے فائدہ حاصل کرنا ہے اور وہ اپنے ساتھیوں کو ہمیشہ یہ بات یاد کرواتا کہ یہاں کے قدرتی مناظر میں کھو جانے کے بجائے اپنے مقاصد سامنے رکھیں۔

مولوی کرامت علی:

مولوی کرامت علی ایک امام مسجد تھا جسے فارسی اور عربی زبان پر عبور حاصل تھا۔ یہ پیشہ اسے باپ دادا سے ملا تھا اور مولوی کرامت بھی یہ تعلیم اگلی نسل میں منتقل کر رہا تھا۔ اس کی تعلیم وہ اپنے بیٹے فضل دین کو دے رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا مستقبل میں اس پیشے کو برقرار رکھے۔ مولوی کرامت علی کا گھر بھی اسی امامت سے چل رہا تھا۔ گاؤں والے اس کی مدد کیا کرتے تھے۔ پہلے وہ مسجد میں بطور امام کام کرتا تھا مگر اس کے بعد وہ ولیم سے ملا۔ ولیم کو مولوی کرامت علی میں کئی خوبیاں نظر آئیں جو ولیم کو فائدہ پہنچا سکتی تھیں۔ اس بنا پر ولیم نے اسے سکول میں بطور استاد مقرر کر لیا جہاں وہ عربی اور فارسی کی تعلیم دیتا تھا۔ مولوی کرامت کو کسی سے غرض نہیں ہوتی تھی سوائے اپنے کام کے۔ جہاں اسے لگتا تھا کہ اسے فائدہ ہو گا وہ وہاں محنت کرتا تھا۔ انگریز سرکار کے ہوتے ہوئے کرامت علی کو سرکاری نوکری مل گئی۔ یہ اس کے لیے کسی معجزے سے کم نہ تھا اور اس کے لیے وہ ہندوستانیوں کا نہیں بلکہ انگریز سرکار کا شکر گزار تھا۔ وہ انگریز حکومت کے خلاف نہیں تھا۔ نوکری ملنے سے پہلے بھی وہ انگریز سرکار سے بڑی عاجزی سے بات کرتا تھا اور ان کا احترام کرتا تھا:

آپ کا غلام اور انگریز سرکار کا نام لیوا کرامت ہی ہوں۔ مولوی کرامت علی نے سارے جسم کی عاجزی چہرے پر سمیٹتے ہوئے جواب دیا۔

ولیم کو اس کی یہ عاجزی اور انکساری پسند آئی اور اس کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئی۔ ولیم نے اسے بطور استاد مقرر کر لیا۔ انگریز سرکار کی نوکری میں بھی مولوی کرامت علی ان کا شکر گزار رہتا اور انگریزوں کی تعریفیں کرتے نہ تھکتا۔

بس سرکار خدا واقف تھا، یا ہماری انگریز سرکار بہادر کمشنر صاحب کی مہربانی تھی۔

مولوی کرامت علی کے ذمے ولیم نے ایک کام لگایا کہ اسے تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ اپنے مسلمان لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرنا ہو گا کہ وہ انھیں سکولوں میں داخل کروائیں اور یہ کام مولوی کرامت علی بخوبی سرانجام دے رہا تھا۔ اس طرح سکولوں میں مسلمان بچوں کی تعداد میں اضافہ ہو تا گیا۔ مولوی کرامت علی دل لگا کر کام کرتا تھا اور ایک محنتی انسان تھا۔ اس کے کام کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ولیم نے اسے گھر دیا۔ جہاں وہ اپنے بیوی بچوں کو لے آیا اور وہیں رہنے لگا۔ ایسے گھر کا ملنا اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اب مولوی کرامت پہلے سے زیادہ دل چسپی سے کام کرنے لگ گیا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اگر انگریز سرکار کی باتیں مانتا رہا تو اسی طرح ترقی ملتی رہے گی۔ اسی لیے وہ مسلسل کام کرتا رہتا اور اپنے کاموں میں مصروف رہتا۔ اس کی ایک خاصیت یہ بھی تھی کہ وہ لڑائی جھگڑوں سے

کوسوں دور رہتا تھا۔ بس اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ انگریز سرکار اسے کبھی بھی کوئی شکایت نہ ہو تا کہ اس کے روز گار میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔

ملک بہزاد:

ملک بہزاد شیر حیدر کا بہت اچھا دوست تھا، منجھا ہوا شخص تھا۔ چہرہ چوڑا اور ہڈ کاٹھ کھلے کھلے تھے۔ اس کا گاؤں

جلال آباد سے تیس میل کے فاصلے پر عالمکے اُتر تھا۔ رنگ سانولا سے زیادہ کالا ہو چکا تھا۔ کئی مرتبہ فیروزپور جیل گیا مگر الٹے کاموں سے باز نہ آیا۔ ملک بہزاد انگریز حکومت کو بہت اچھے طریقے سے جانتا تھا۔ اس لیے اسے معلوم تھا کہ ان کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرنا ہے۔

رہی بات انگریز سرکار کی، تو یہ کبھی ہوتی تھی جب انھوں نے دلی نئی نئی فتح کی تھی۔ اب ان کے بھی کچھ اور ہی لچھن ہیں۔ کیا تو نہیں دیکھتا؟ یہ انگریزی بابو اور می یہ انگریزی بابو اور محیں یہاں کتے لڑوانے، زمینیں خریدنے، کبوتر اڑانے اور کوٹھیاں بنانے کا دھندا کھلے کھیتوں کرتے یں اور یہ سب عیاشیاں رشوت کے بغیر نہیں ہوتیں۔

ملک بہزاد کا عدالت کچہری میں روزانہ آنا جانا ہوتا تھا۔ کچہری کے وکیل، جج سب سے واقف تھے۔ ان میں کئی ایسے بھی تھے جن سے ملک بہزاد کے ذاتی مراسم قائم ہو گئے تھے۔ اسے کئی دعوے تھے کہ اس نے سینکڑوں قتل کیے ہوئے ہیں مگر اس کا ثبوت نہ تو کبھی عدالت دے سکی اور نہ ہی وہ خود۔ تھانے میں، عدالتوں میں کہیں کوئی کام ہوتا تو لوگ ملک بہزاد سے مدد مانگتے اور یہ ان کی مدد بھی کرتا۔ دنگے فساد کا کہیں بھی معاملہ پیش آتا تو ملک بہزاد ایسے ایسے مشورے دیتا کہ مخالف کو بھی خبر ہو جاتی کہ اس کے پیچھے ملک بہزاد کا ہاتھ ہے۔ ادھر ملک بہزاد بھی اپنے مدعی کی شکست برداشت نہیں کرتا تھا اس کے لیے وہ جارحیت سے بھی باز نہیں آتا تھا۔ انھی خدا واسطے دشمنیوں میں اسے خود بھی کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ غلام حیدر کو سمجھاتے ہوئے کہتا ہے کہ:

بھائی دشمن دشمن ہوتا ہے۔ اس کے اپنے موڈ ہوتے ہیں۔ اس سے شکوہ کرنے والے بزدل ہوتے ہیں۔ تم اپنے ذمہ دار ہو اور سکول میں پڑھنے والے لاڈلے نہیں بلکہ اپنی رائے اور فیصلوں پر اختیار رکھتے ہو۔ اس لیے اب دشمن سے شکورہ یا بچاؤ نہیں۔ اس پر جارحیت کا سوچو کیوں کہ بچاؤ کمزور کرتا ہے اور آگے بڑھ کر حملہ کرنا مردوں میں حوصلے ل کا باعث ہوتا ہے۔ یہی شیروں کا کام ہے۔

ملک بہزاد یہاں بھی غلام حیدر سے اس کے دشمن سودھا سنگھ سے بدلہ لینے کا مشورہ دے رہا ہوتا ہے اور اس کا خون گرما رہا ہوتا ہے۔ اس کے لیے وہ اسے ہر بات سے آگاہ کرتا ہے اور پورا منصوبہ بنا کر دیتا ہے کہ کس طرح ان سے بدلہ لینا ہے اور انگریز حکومت سے کیسے بچنا ہے۔

اپنی ریفل کی گولیاں جتنی خرید سکتا ہے خرید لے لیکن اس کی نمائش کم کر دے اور گورنمنٹ کا بار بار دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ اسے کہو، جو میرے ساتھ ظلم ہوا ہے، اس کا حساب لے کر دو۔ اس کے علاوہ بگھیوں پر سفر کرنا چھوڑ دے۔ والدہ کو ان کے پیکے چھوڑ آؤ بلکہ ایسی جگہ بھیج دو جس کے بارے میں کسی کو بھی پتہ نہ ہو تا کہ مجھے دوسری پریشانی کا سامنا نہ ہو۔

ملک بہزاد کو ان سب چیزوں کا چسکا پڑ گیا تھا، جو مرنے کے ساتھ ہی ختم ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ملک بہزاد کو ایک اور بھی چسکا تھا۔ وہ لوگوں کو طرح طرح کی کہانیاں سناتا تھا۔ ایسے کہانی سناتا تھا کہ لوگ عش عش کر اٹھتے۔

فضل دین:

فضل دین مولوی کرامت علی کا بیٹا تھا جسے بچپن میں اس کے والد نے فارسی اور عربی کی تعلیم دی۔ مولوی کرامت سختی سے اسے پاس بٹھا کر تعلیم دیتا تھا۔ باقی وقت میں فضل دین اپنے گاؤں میں گھر گھر جا کر روٹیاں اکٹھی کر کے لاتا اور مسجد کا پانی بھرتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے دن پھرنے لگے۔ مولوی کرامت کو انگریز سرکار نے نوکری دی تو مولوی کرامت نے اپنے بیٹے کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے لاہور بھیج دیا۔ فضل دین نے تعلیم حاصل کی تو ولیم کے پاس چلا گیا۔ جو ان دنوں لاہور میں رہائش پذیر تھا۔ ولیم نے اسے انگریز سرکار میں نوکری دلوا دی۔ اب فضل دین انگریزی بابو بن گیا تھا۔

فضل دین ایک ہی سال میں کئی باتیں انگریزی میں ہی بولنے لگا۔ چھٹی پر جلال آباد آتا تو لوگ دیکھنے کے لیے آتے اور باتوں باتوں میں ایک دوسرے کو کہتے، بھائی مولوی کا بیٹا تو کوئی بڑا انگریز بنتا جا رہا ہے۔

مولوی فضل دین نے اپنی انتھک محنت کی وجہ سے لاہور میں گھر بھی خرید لیا اور دفتر میں اپنے سارے کام بخوبی کرتا۔ فضل دین کی فطرت بھی اپنے باپ جیسی تھی۔ وہ بہت محنتی آدمی تھا۔

اپنے باپ مولوی کرامت کی طرح فضل دین بھی مسلسل کام اور عاجزی کا پیکر تھا۔ ان خوبیوں کی وجہ سے تمام افسروں کا منظور نظر ہو گیا۔ جس نے جو بھی کام کہا، چاہے آدھی رات تک بیٹھنا پڑتا، فضل دین اسے مکمل کر کے ہی دم لیتا بلکہ بعض غیر متعلقہ کام بھی اس کے ذمے لگا دیے جاتے تو وہ انھیں بھی ڈیوٹی سمجھ کر پورا کر دیتا۔

فضل دین آفس کے مسلمان افسروں اور کلرکوں کو ظہر اور عصر کی نماز پڑھا دیتا۔ گورنر ہاؤس میں رفتہ رفتہ مولوی فضل دین کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اب اس نے یہ کام دفتر سے باہر بھی باقاعدہ طور پر شروع کر دیا۔ گھر گھر جا کر قرآن پاک پڑھاتا، جنازہ اور نکاح بھی پڑھا دیتا۔ اس طرح اس کی آمدنی میں کئی گنا زیادہ اضافہ ہونے لگا۔ ساتھ ہی اپنے دفتر کے کام بھی اچھے سے سنبھال رہا تھا۔ شادی کے بعد اپنے بیٹے کو افسر بنانے کے خواب دیکھنے لگا۔ اس کے لیے اپنی آمدنی میں سے بچت کرنے لگا اور اس کے لیے محنت میں مگن ہو گیا۔

نوازالحق:

نوازالحق مولانا فضل دین کا بیٹا تھا۔ نوازالحق اتنا ذہین اور لائق تھا کہ اس نے اپنے باپ دادا کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ بڑے بڑے فوجیوں اور افسروں کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ انہی کی صحبت میں دن رات گزارنے سے وہ تمام معلومات اور طریقے اکٹھے کر لیے جو سول سروس کے لیے ضروری تھے۔ عربی، فارسی، انگلش، تاریخ غرض ہر شعبے میں کچھ نہ کچھ دسترس حاصل کر لی تھی۔ بات چیت اور لباس میں بھی اتنی نفاست پیدا کر لی تھی کہ جدھر جانا ہوتا خود کو وہاں کی مناسبت سے ڈھال لیتا۔ اس سے سول سروس کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے چند باتوں کو ذہن نشین کر لیا ان میں سے ایک انگریزی سیکھنا بھی تھا۔

وہ انگریزی کو ایسے چاٹنے لگا کہ بعض اوقات اس پر انگریز ہونے کا شبہ ہوتا۔ وہ تو غنیمت تھی رنگ زیادہ صاف نہ تھا۔

دوسری بات اس نے اقبال کے کلام کو اچھے سے تیار کر لیا اور تیسری یہ کہ اپنے باس کی چاپلوسی کرنے میں کوئی کمی نہ ہو۔ ان تینوں باتوں کو اس نے اچھے سے سیکھ لیا اور ترقی کی منازل طے کرتا گیا۔ سول سروس کا امتحان پاس کر کے ڈائریکٹ نائب تحصیل بھرتی ہو گیا۔ اس نے تمام افسران کے ساتھ تعلقات بنائے ہوئے تھے۔ وہ اس پر ہی مطمئن ہو کر نہ بیٹھا رہا بلکہ مزید ترقی کے لیے محنت کرتا رہا بالآخر اس کی اسسٹنٹ کمشنر کے آرڈر جاری ہو گئے اور اسے پوری سرکاری پروٹوکول کے ساتھ جھنگ شہر کا افسر تعینات کر دیا گیا۔

یہ نوازالحق ہی تھا جس نے اپنے عہدے پر ترقی کے بدلے "نولکھی کوٹھی" کا سودا کر لیا تھا اور ولیم سے وہ کوٹھی چھین کر کسی بارسوخ شخص کے حوالے کر دی تھی جیسے ازل سے وہ اسی کے لیے بنی تھی۔ یہ کام کر کے اس نے نسلی گداگر ہونے کا ثبوت دے دیا۔

شاہ صاحب! اگر میں آپ کے کسی کام آنے کا ہوا تو یہ میری خوش نصیبی کی بات ہے۔ آپ ہی تو ہماری دنیا اور آخرت ہیں۔

جس شخص نے کوٹھی لی اسے بھی معلوم تھا کہ یہ سیر اکام ضرور کرے گا اس لیے نوازالحق کو کہتا ہے کہ:

کمشنر صاحب! آپ کے اس بڑی نہر کے دوسری طرف ایک نولکھی کوٹھی خالی پڑی ہے، جس کے ساتھ کچھ زمین بھی ہے۔ اس اسٹیٹ کی اکثر زمین تو فوجیوں کو الاٹ ہو چکی ہے لیکن کوٹھی ابھی تک کسی کو الاٹ نہیں ہوئی۔ آپ کسی طرح اسے میرے نام کروادیں، جو خرچہ ہوا، میں دینے کو تیار ہوں۔

دراصل یہ سب کرنے کے عوض نوازالحق شاہ صاحب سے اپنا کام نکلوانا چاہتا تھا۔ نوازالحق کو اندازہ تھا کہ ان بڑے لوگوں سے اپنا کام کیسے نکلواتے ہیں۔ اس لیے اس نے پہلے وہ کوٹھی شاہ صاحب کے نام کرنا مناسب سمجھا اور اس کے بعد شاہ صاحب سے اپنی ترقی کے بارے میں فرمائش کر دی:

گاڑی چلنے لگی تو نواز صاحب نے ہنستے ہوئے پیر صاحب سے کہا، سر اس خادم کا بھی خیال رکھا کریں۔ آخر کب تک اسسٹنٹ کمشنری کرتا پھروں گا۔ آپ کی سلطنت میں کم از کم مجھے ڈپٹی کمشنر تو ہونا ہی چاہیے۔ ایک دفعہ بس ایک درجہ اوپر لے جایئے۔ پھر دیکھیے نوکر کس طرح شاہ صاحب کی خدمت کرتا ہے۔

امیر سجانی:

امیر سجانی ایک داستان گو تھا اور داستان میں وہ مبالغے کی حد تک ملاوٹ کرتا تھا۔ کسی کے بارے میں بھی خود سے کہانی گڑھ لیتا تھا اور لوگوں کو بتانے لگ جاتا تھا اور سب اس کی بات کا ایسے یقین کر لیتے تھے جیسے وہ سچ کہہ رہا ہو۔ غلام حیدر کی شان و شوکت میں اضافہ کرنے کے لیے سردار سودھا سنگھ کے قتل کے قصے وہ گاؤں گاؤں جا کر سناتا اور اس کی آواز ریکارڈ کر کے بھی غلام حیدر کے قصوں کو گاؤں، گلی محلوں میں سنایا جاتا تھا۔

ایک بڑا کام تو منصوبے کے مطابق پہلے ہی امیر سجانی کے ریکارڈ نے کر دیا تھا جو اب چھوٹی چھوٹی دھاریوں پر بھی بج رہا تھا۔

ایسا اس لیے کیا جاتا تا کہ لوگوں پر غلام حیدر کا رعب بیٹھ جائے اور لوگ مسلم لیگ کو ووٹ دیں۔ تقسیم کے وقت جب غلام حیدر ریل پر لڑتے لڑتے اپنی جان دے بیٹھتا ہے تب امیر سجانی اس کی لاش کو اٹھا کر اس کے گھر والوں کے حوالے کر آتا ہے۔

تقسیم کے بعد جب ولیم بالکل اکیلا ہو جاتا ہے تو وقت گزاری کے سلسلے میں اسے داستان سننے کی لت لگ جاتی ہے۔ ایک دن امیر سجانی ہی داستان گو نکلتا ہے۔ امیر سجانی اس قدر خوب صورتی سے داستان سناتا کہ وہاں موجود تمام لوگ اپنے کام کاج بھول کر صرف اس کی طرف متوجہ رہے اور داستان گوئی کا لطف اٹھاتے رہے اور ولیم کی آنکھوں کے سامنے سارا نقشہ آ گیا کیوں کہ جس کے بارے میں امیر سجانی داستان سنا رہا تھا ولیم اسے بہت اچھے طریقے سے جانتا تھا:

اس شہر جلال آباد میں، تھا ایک جوان دلیر
بیٹا حیدر شیر کا تھا، دھرتی کا وہ شیر
نام غلام حیدر اس کا ، جانے سب سنسار
ہوا شہید وہ سورما، پرچے گورکھے مار

تقسیم ہند سے قبل امیر سبحانی خود سے داستانیں بنا کر لوگوں کو سناتا مگر تقسیم ہند کے بعد غلام حیدر سے جڑے قصوں کو اتنے عمدہ طریقوں سے بیان کرتا کہ لوگ اس کی تعریفیں کرتے رہتے۔

مجموعی طور پر اگر ناول میں کرداروں کی بات کی جائے تو ناول کا ہر کردار اپنا اپنا کام سرانجام دے رہا ہے۔ ناول میں مردانہ کردار زیادہ پائے گئے ہیں اس کی نسبت زنانہ کردار کم ہیں۔ ناول میں ایسے کردار پیش کیے گئے ہیں جو ناول کی نو آبادیاتی فضا میں اپنا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ نو آبادیات کو سامنے رکھتے ہوئے ناول کے کرداروں پر غور کیا جائے تو پورا نو آبادیاتی ماحول ملتا ہے جس میں کچھ کردار حکومت کر رہے ہیں تو کچھ کردار غلامی کر رہے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ علی اکبر ناطق،یاقوت کے ورق (کراچی: سٹی پریس بک شاپ، ۲۰۱۳ء)، ص۵۔

۲۔ علی اکبر ناطق،قائم دین (افسانے) (کراچی: او کسفورڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۱۲ء)، ص۵۵۔

۳۔ علی اکبر ناطق،بے یقین بستیوں میں (نظمیں) (کراچی: سٹی پریس بک شاپ، ۲۰۱۰ء)، ص۲۵۔

۴۔ علی اکبر ناطق،نولکھی کوٹھی (جہلم: بک کارنر جہلم، ۲۰۱۴ء)، ص۴۰۔

۵۔ ایضاً۔

۶۔ الحاج مولوی فیروز الدین،فیروز اللغات (لاہور: فیروز سنز، ۱۹۵۲ء)، ص۲۵۵۔

۷۔ http://dictionary.cambridge.org/amp/english/character، بتاریخ ۱۰ مئی ۲۰۲۲ء، بوقت ۱۲:۰۰ بجے۔

۸۔ www.collinsdictionary.com/dictionary/english/character، بتاریخ ۱۰ مئی ۲۰۲۲ء، بوقت ۲:۰۰ بجے۔

۹۔ جمیل جالبی،ٹی۔ایس ۔ ایلیٹ۔ شاعری کی تین آوازیں، ص۶۰۔۶۱۔

۱۰۔ نجم الہدیٰ، کردار اور کردار نگاری (پٹنہ: کتاب منزل سبزی باغ، ۱۹۸۰ء)، ص۴۳۔

۱۱۔ علی اکبر ناطق،نولکھی کوٹھی، ص۳۶۹۔

۱۲۔ ایضاً، ص۷۶۔

۱۳۔ ایضاً، ص۸۷۔

۱۴۔ ایضاً، ص۲۲۸۔

۱۵۔ ایضاً، ص۳۳۸۔

۱۶۔ ایضاً، ص۳۷۱۔

۱۷۔ ایضاً، ص۳۶۶۔

۱۸۔ ایضاً، ص۲۹۵۔

۱۹۔ ایضاً، ص۳۶۴۔

۲۰۔ ایضاً، ص۳۹۲۔

۲۱۔ ایضاً، ص۸۸۔۸۹۔

۲۲۔ ایضاً، ص۹۴۔

۲۳۔ ایضاً، ص۱۳۰۔

۲۴۔ ایضاً، ص۲۹۶۔

۲۵۔ ایضاً، ص۱۷۹۔۱۸۰۔

۲۶۔ ایضاً، ص۳۸۳۔

۲۷۔ ایضاً، ص۳۲۳۔

۲۸۔ ایضاً، ص۳۶۸۔

۲۹۔ ایضاً، ص۳۶۱۔

۳۰۔ ایضاً، ص۲۵۷۔۲۵۸۔

۳۱۔ ایضاً، ص۲۵۸۔

۳۲۔ ایضاً، ص۳۲۔

۳۳۔ ایضاً، ص۳۳۔

۳۴۔ ایضاً، ص۳۵۔

۳۵۔ ایضاً، ص۸۱۔

۳۶۔ ایضاً، ص۲۱۹۔

۳۷۔ ایضاً، ص۲۰۳۔

۳۸۔ ایضاً، ص۱۹۷۔

۳۹۔ ایضاً، ص۲۰۴۔

۴۰۔ ایضاً، ص۳۲۲۔

۴۱۔ ایضاً، ص۳۵۹۔

۴۲۔ ایضاً، ص۴۱۴۔

۴۳۔ ایضاً، ص۴۲۶۔

۴۴۔ ایضاً، ص۴۲۶۔

۴۵۔ ایضاً، ص۴۲۸۔

۴۶۔ ایضاً، ص ۳۶۳۔

۴۷۔ ایضاً، ص ۴۱۰۔

باب سوم:

نولکھی کوٹھی کے اسلوب کا نوآبادیاتی تناظر میں مطالعہ

باب سوم:

”نولکھی کوٹھی“ کے اسلوب کا نوآبادیاتی تناظر میں مطالعہ

اسلوب:

اسلوب سے مراد طریقہ، روش یا طرز وغیرہ ہے۔ ہر انسان کے بات کرنے کا ڈھنگ، اس کے فکر و خیال کا ڈھنگ جو دوسروں سے مختلف ہو اسے اسلوب کا نام دیا جاتا ہے۔ جس طرح کسی رائے کے اظہار کے لیے کسی خیال کی ترجمانی ضروری ہے اسی طرح اظہار کے لیے اسلوب لازمی جزو ہے۔ اسلوب کے مختلف زبانوں میں مختلف نام ہیں مگر اس کا کام تحریر میں چاشنی پیدا کرنا ہے۔

اسلوب کسی قاعدے کا نام نہیں اور نہ ہی اس کے لیے کوئی طے شدہ قاعدے کے تحت پابندی کی جاتی ہے بلکہ یہ تو وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا اور تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ہر دور کا ایک خاص اسلوب ہوتا ہے اور ہر فرد کا اسلوب بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ یہ مصنف کی کاوش ہوتی ہے کہ وہ کس وقت کون سا اسلوب اختیار کر لے۔

انگریزی میں اسلوب کے لیے لفظ Style استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب وضع، انداز، طرح، تحریر یا تقریر ہے۔[1]

اردو میں لفظ ”اسلوب“ عربی سے مشتق ہے۔ مختلف لغات میں اس کے مفاہیم درج ذیل ہیں:

فیروز اللغات کے مطابق:

اسلوب (ع۔ا۔مذ) طریقہ، طرز، روش، جمع: اسالیب[2]

فرہنگ عامرہ میں اسلوب سے مراد طریقہ، طرز اور روش۔[3]

A Comprehensive Persian-English Dictionary کے مطابق:

Order, arrangements, way, mode, means, measure, manner, method, form, figure, a lions neck, a prominence of nose.[4]

A Dearner's Arabic-English Dictionary کے مطابق:

اسلوب: Way, course, manner, style, method, length[5]

قومی انگریزی لغت میں:

اسلوب تحریر و تقریر (بلحاظ زبان)

ادب میں موضوع سے زیادہ اسلوب پر زور دینے والا یا اس سے تعلق رکھنے والا؛ کسی ادیب یا ادیبوں کے گروہ کا شناختی اسلوب، فنون میں خارجی اسلوب، روش یا انداز، کوئی مخصوص طرزِ ادا۔۔۔[۶]

اسلوب کیا ہے؟ کیا یہ کوئی ٹھوس شے ہے یا پھر صرف محسوسات کی چیز ہے؟ کیا ہر لکھنے والے کے ہاں یہ لازمی جزو ہے یا کسی کسی کے پاس نمودار ہوتا ہے۔ یہ سب ایسے سوال ہیں جن کا حتمی کوئی جواب نہیں۔ ڈربی شیائر کے مطابق:

> In the past many writers on style seem to have thought of it as a positive and rare quality in writing to which an author ought to aspire.[۷]

زمانہ قدیم سے ہر ادیب کی یہ خواہش رہی کہ وہ صاحب اسلوب ہو، مگر کیا اسلوب کوئی ایسی چیز ہے جسے لکھنے والا خود حاصل کر سکتا ہے۔ شاید اسی غلط فہمی کے سبب بہت سے لوگ لفظوں کی بازی گری کر کے اسے اسلوب کا نام دے دیتے ہیں۔ ڈاکٹر اعجاز راہی کہتے ہیں:

> خارج میں رونما ہونے والی تبدیلی ہی نئے زمانے کا تعین کرتی اور نئے اسلوب کی بازیافت کا بار اٹھاتی ہے اور اس طرح نیا زمانہ نئے اسلوب کے ہم رکاب اپنی شناخت کرواتا ہے یعنی اسلوب ہی وہ بنیادی شے ہے جو ایک زمانے کو دوسرے زمانے تک، ایک شے کو دوسری شے تک، ایک ادب پارے کو دوسرے سے الگ کرتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ اسلوب خود کیا ہے؟ کیا اسلوب خود زمانہ ہے؟ شے ہے؟ یا کچھ اور؟ اسلوب کا وجود ہوتا ہے؟ یا مختلف پھولوں کی خوشبو کی طرح اپنی شناخت کراتا ہے؟[۸]

اس سے ایک چیز واضح ہے کہ اسلوب کا زمانے کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ اسلوب میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ ویلری (Valerie) کہتا ہے کہ:

> اسلوب اظہارِ ذات میں ترتیب کو با معنی بنا دیتا ہے (اس سے قطع نظر کہ اظہار ذات کیا ہے) اس کے فکری تقاضوں کا انکشاف کرتا ہے۔ یہ فکر کی اصل صورت سے قطعی لا تعلق ہوتا ہے کہ فکر کا اپنا کوئی اسلوب نہیں ہوتا۔ یہ اظہار کا فن ہی ہے جو کہ ایک فن کار کو دوسرے سے ممیز کرتا ہے۔[۹]

ابو الاعجاز حفیظ صدیقی کشاف تنقیدی اصطلاحات میں اسلوب کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں

کہ:

اسلوب سے مراد کسی ادیب یا شاعر کا وہ طریقہ، ادائے مطلب یا خیالات و جذبات کے اظہار و بیان کا وہ ڈھنگ ہے جو اس خاص صنف کی ادبی روایت میں مصنف کی اپنی انفرادیت (انفرادی خصوصیات) کے مشمول سے وجود میں آتا ہے اور چوں کہ مصنف کی انفرادیت کی تشکیل میں اس کا علم، کردار، تجربہ، مشاہدہ، افتاطبع، فلسفہ حیات اور طرزِ فکر و احساس جیسے عوامل مل جل کر حصہ لیتے ہیں۔ اس لیے اسلوب کو مصنف کی شخصیت کا پرتو اور اس کی ذات کی کلید سمجھا جاتا ہے۔[۱۰]

اسلوب کی پرداخت میں مصنف کے افکار و خیالات اور اس کے مشاہدات کے ساتھ ساتھ اس دور کے موضوعات اور سیاسی و سماجی، معاشی حالات و واقعات بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ مصنف جن شخصیات سے متاثر ہوتا ہے اور اس کا ذہن شعوری اور لاشعوری طور پر جن واقعات کا اثر قبول کرتا ہے ان کے گہرے اثرات مصنف کی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں۔ مصنف اپنے معاشرے کی بہترین عکاس ہوتا ہے۔ اس طرح کسی تصنیف کا مطالعہ کرنے سے ہم اس عہد کی زبان، موضوعات، معاشرت، مصنف کی شخصیت اور سیاسی و تمدنی اثرات کا بھی پتہ لگا سکتے ہیں۔

اسلوب شخصیت کا عکاس ہوتا ہے۔ اس لیے اسلوب کو شخصیت کے اظہار کا نام بھی دیا جاتا ہے لیکن شمس الرحمان فاروقی شخصیت اور اسلوب کو ایک دوسرے سے جدا تصور کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

بوفون (Buffon) کا اصل قول ہے Homme meme۔ اس کے انگریزی ترجمے Style is the man himself اور اس کے اردو ترجمے "اسلوب دراصل خود شخص ہے" سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ اسلوب اگر شخصیت کا اظہار ہے تو پھر اسلوب کا مطالعہ چھوڑ کر شخصیت کا مطالعہ مفید ہوگا۔[۱۱]

سید عابد علی عابد نے اسلوب کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

اسلوب دراصل فکر و معانی اور ہیئت و صورت یا مافیہ و پیکر کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے لیکن انتقادی تصانیف میں اکثر و بیشتر کلمات مستعملہ کے معانی متعین نہیں ہوتے اور اسلوب کو محض اندازِ نگارش، طرز بیان کہہ کر اس کلمے کی وہ تمام دلالتیں ظاہر نہیں کی جا سکتیں، جن کا اظہار مطلوب ہے۔[۱۲]

اسلوب ایک ایسا طرز ہے جس سے وہ دوسرے لکھنے والوں سے ممیز ہو جاتا ہے اور اس انفرادیت کو اپنانے میں بہت سے عوامل شامل ہوتے ہیں۔ انفرادیت ہی اسلوب کی اصل پہچان ہے۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے اسلوب کی نقل کرتا ہے تو پہلے تو اس شخص کو اپنی شخصیت، ماحول اور اپنی عادات و اطوار اس شخص سے مستعار لینا

ہوں گی پھر وہ اس کے اسلوب کا چربہ اتار سکے گا۔

مغربی مصنف ایمرسن (Amerson) اسلوب کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

A man's style is his mind voice. [۱۳]

اسلوب ایک ایسی شے کا نام ہے جس میں توازن کا ہونا ضروری ہے۔ ایک عمدہ اسلوب وہی کہلائے گا جس میں توازن ہو گا۔ ادھر توازن سے مراد ہے کہ مصنف نے الفاظ کا استعمال خوب صورتی سے برتا ہے۔ جملوں کی ساخت مضبوط ہو، خیال اور معنی کا آپس میں مربوط رشتہ ہو یعنی کہ لفظوں کے انتخاب میں خوب صورتی ہو۔ اس ضمن میں واربرگ (Warburg) لکھتے ہیں کہ "احسن اسلوب (Good Style) تقریباً متوازن معنی والے الفاظ میں انتخاب سے تشکیل پاتا ہے۔"[۱۴]

ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول:

> سٹائل صرف خارجی خصائص تحریر کا نام نہیں بلکہ مصنف کی شخصیت کے داخلی نقوش اور اس کا طرزِ مشاہدہ ہی نہیں بلکہ اس کا طرزِ احساس بلکہ اس سے آگے مصنف کے زمانے، قوم بلکہ اس کی پوری تہذیب کے نقوش کا نام ہے۔[۱۵]

ڈاکٹر سید عبداللہ اسلوب کے وسیع تر معنوں میں داخلی اور خارجی احساسات کے ساتھ ساتھ اسے تہذیب کی نمائندگی کا ذریعہ بھی قرار دیتے ہیں۔ اسلوب جس طرح مصنف کے احساسات کی ترجمانی کرتا ہے اسی طرح ملک و قوم کی تہذیب اور اس عہد کو بھی روشناس کراتا ہے۔ وقت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ زبان و بیان میں بھی نئے الفاظ جگہ بناتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پرانے الفاظ کو متروک کر دیا جاتا ہے۔[۱۶] ادب کا فریضہ ہے کہ ایک خاص عہد میں ہونے والی تبدیلیوں کو اپنے اندر سمو کر اس عہد کی جھلک پیش کرے۔ اسی طرح ایک ہی عہد میں مختلف اصنافِ ادب کو مختلف ادیب روشناس کرانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ہم کسی عہد کی ایک تصنیف کا مطالعہ کر کے اس عہد کا کلی تجزیہ نہیں کر سکتے۔ ایک تصنیف کا ایک ہی صنف ادب سے تعلق ہوتا ہے اور اس میں مصنف کے اسلوب کا بھی عمل دخل ہوتا ہے جو اس عہد کے ساتھ ساتھ اس مصنف کی بھی شناخت ہے۔ گوپی چند نارنگ کے بقول:

> اشخاص اور اصناف سے ہٹ کر اسلوبیاتی تجزیے کی ایک جہت اور بھی ہے۔ چوں کہ ادبی ارتقا میں اظہار کے لسانی پیرائے عہد بہ عہد تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اسلوبیات کی مدد سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کس عہد میں کون سا اسلوب رائج تھا یا کسی عہد کی زبان کے لسانی امتیازات کیا تھے۔ مرزا خلیل احمد بیگ لسانیات اور اسلوبیات کو ایک دوسرے سے مربوط کرتے ہیں۔[۱۷]

اسلوبیاتی یا لسانی اسلوبیات ادب کے لسانیاتی مطالعے، یعنی ادب میں زبان کے استعمال یا ادبی زبان کے مطالعے اور تجزیے کا نام ہے جو لسانیات کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ہر لسانیاتی مطالعہ اسلوبیاتی مطالعہ قرار نہیں دیا جا سکتا، لیکن ہر اسلوبیاتی مطالعہ لسانیاتی مطالعہ بھی کہلا سکتا ہے۔ ادب کے اسلوبیاتی مطالعہ کی بنیاد لسانیاتی تجزیے پر رکھی جاتی ہے۔

اس ساری بحث کو دیکھا جائے تو اس ساری گفتگو کو اس نتیجے پر لایا جا سکتا ہے کہ اسلوب ایک ادیب کی مسلسل محنت، اس کی ذات کا حسن، اس کی لفظیات، اس کے فقرے اور موضوع کے ساتھ اس کی وابستگی اور پھر بار بار اس کا استعمال ایک طرز کو جنم دیتا ہے اور یہ ہی اسلوب بن کر اس کی شخصیت کو نمایاں کرتا ہے۔

یہاں ایک بات ضروری ہے کہ اسلوب صرف انفرادی نہیں ہوتا بلکہ ہر زمانہ اپنے لیے ایک اجتماعی اسلوب کو تشکیل دیتا ہے اور اسی اجتماعی اسلوب کی بنا پر ایک دور کو دوسرے دور سے الگ کر کے اس کی شناخت کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم ایک نثری قصہ کسی داستان کا لیں، کسی ناول یا افسانے کا ایک نثری قصہ لیں تو ان دونوں کو پڑھتے ہوئے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ نثر داستانی عہد سے تعلق رکھتی ہے۔

اسلوب کسی بھی ادبی فن پارے کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اظہار کا وسیلہ جو تخلیق کار کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس کی تحریر سے اس کے زمانے اور اس کے ماحول کی جھلک نظر آتی ہے۔ تخلیق کار کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تحریر بامعنی ہو اور پڑھتے ہوئے بوجھل محسوس نہ ہو۔ مصنف اور اسلوب ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔ مصنف جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے، اس کے اثرات قبول کرتا ہے۔ جس معاشرے میں اس کی تعلیم و تربیت ہوتی ہے یا جن مصنفوں کی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے ان سب عوامل کا اثر اس کے اسلوب میں موجود ہوتا ہے۔ مغربی مصنفین اور نقادوں نے بھی اسلوب کو شخصیت سے منسوب کیا ہے۔ اسلوب مصنف کی شخصیت کا نمونہ ہوتا ہے۔ اس کے اسلوب سے مراد وہ منفرد انداز بیان ہے جس کے تحت ہم مصنف کی شخصیت کو بے نقاب کر سکتے ہیں۔ ایک منفرد شخصیت میں جو عناصر شامل ہوتے ہیں وہی اس کے مخصوص اسلوب کی نشان دہی کرتے ہیں۔ مصنف جب کسی خیال کو دوسرے تک پہنچانا چاہتا ہے تو اس کے لیے نئے نئے اسالیب تراشتا ہے، کہیں ایہام سے کام لیتا ہے تو کہیں تشریح، تشبیہات وغیرہ سے۔ مگر اس سب کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ جو سوچ رہا ہے، جو خیال اس کے دماغ میں ہے وہ دوسروں تک پہنچ جائے مگر اس سے پر تکلف عبارتیں وجود میں آتی ہیں کہ لکھنے والا خیال سے زیادہ الفاظ کو اہمیت دینے لگ جاتا ہے۔ چناں چہ اچھے اور معیاری اسلوب کے لیے الفاظ کا انتخاب، ان کی ترتیب ا، ان کے درمیان معنوی ربط، فقروں کے درمیان فن کارانہ ہم آہنگی کی بڑی اہمیت ہے۔ انہی اجزا کی بدولت اسلوب موزوں اور حسین بنا

ہے۔ اس کے لیے فطری صلاحیتیں، مطالعہ اور شخصیت کا تاثر بھی ضروری ہے۔ ان دونوں کے حسین روابط سے اسلوب وجود میں آتا ہے۔

کلچر اور وقت کے بدلنے سے اسلوب بھی متاثر ہوتا ہے۔ اس میں تبدیلیاں رونما ہونے لگتی ہیں۔ کلچر تبدیل ہونے کا مطلب ہے کہ معاشرے میں نئے نئے نظریات جنم لیتے ہیں جس سے تخلیقی قوتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ کلچر کے اسی بدلنے کی وجہ سے نئی نئی تخلیقات وجود میں آتی ہیں۔ اس سلسلے میں گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں کہ:

> زبانوں کی ضرورتیں وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ ان میں جہاں صحت واصول اور معیار بندی پر اصرار کرنا ضروری ہوتا ہے وہاں لفظ و معنی کی نئی تخلیقی سطحوں کی دریافت کرنا اور زبان کی چلن کی نئی عمرانیاتی ضرورتوں پر نظر رکھنا بے حد ضروری ہے۔ [۱۸]

یہاں ایک اور بات قابلِ غور ہے کہ اگرچہ یہ سچ ہے کہ بہت سے مصنفین کا اپنا منفرد اسلوب ہوتا ہے جسے انفرادی اسلوب کہا جاتا ہے جو اس کے الفاظ کے استعمال اور اس کی دیگر خصوصیات کی وجہ سے پہچان لیا جاتا ہے لیکن جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں وہ اس شخصیت کے علاوہ اس دور کے آئینہ دار بھی ہوتے ہیں یعنی کہ اسلوب میں صرف شخصیت کا ہی عنصر کارفرما نہیں ہوتا بلکہ اس دور، اس کلچر میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے زبان پر جو اثرات ہوتے ہیں وہ الفاظ بھی شامل ہوتے ہیں۔

اسلوب کا ادب کے ساتھ بہت گہرا رشتہ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ آج بھی اسلوب سے ادبی زبان مراد لیتے ہیں اور اسلوب کو "اچھی"، "موثر" اور "خوب صورت" تحریر کی خصوصیت سمجھتے ہیں۔ اسلوب کو اب تک صرف ادبی نقاد کی توجہ کا مرکز خیال کیا جاتا تھا لیکن زبان و اسلوب کے درمیان گہرے باہمی رشتے کی شناخت و تعین کے بعد اسلوب کا مطالعہ ماہرین لسانیات کی بھی توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔

مختصر طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اسلوب ایسی شے ہے جس سے ہمیں مصنف کے قوت بیانیہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنے احساسات اور خیالات کو بہتر طور پر بیان کرنے کا اہل ہے تبھی وہ ایک کامیاب ادیب کہلایا جائے گا۔ عمدہ اسلوب سے ہمیں مصنف کی ذہنی پرورش کا اندازہ ہوتا ہے اور اس کے ساتھ اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی مصنف اپنے جذبات اور خیالات کو دوسروں تک کس حد تک پہنچانے میں کامیاب ہوا ہے اور یہ سب اسلوب کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

اسلوب کی خصوصیات:

ہر مصنف کا اسلوب دوسرے مصنفین سے مختلف ہوتا ہے جس طرح کسی تحریر کو لکھتے وقت ہم الفاظ کا چناؤ کرتے ہیں اسی طرح مصنفین اپنے خیالات کا اظہار کرتے وقت مختلف الفاظ و تراکیب کا استعمال کرتے ہیں جو ان کا

اسلوب کہلاتا ہے۔ اسی اسلوب کی وجہ سے ایک مصنف دوسرے مصنفین کی نسبت زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ادب میں اسلوب کی خصوصیات کو کئی محققین نے بیان کیا ہے مگر عابد علی عابد اور گوپی چند نارنگ کی بیان کردہ اسلوب کی خصوصیات زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔

عابد علی عابد نے جن اسلوب کی خصوصیات کو بیان کیا ہے ان میں سادگی، قطعیت، اختصار، زورِ بیان، گداز، مزاج، تجسیم، خیال افروزی، تصویریت اور مجاز و استعارہ شامل ہیں۔ اسلوب کی خصوصیات گوپی چند نارنگ نے بھی بیان کی ہیں جس میں سادگی، خطاب کا انداز، بیانیہ نثر اور عام فہم نثر شامل ہیں۔

اسلوب میں سادگی کو اہمیت حاصل ہے۔ مصنف کا اسلوب جس قدر سادہ ہوگا اسے سماج میں اسی قدر پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ اگر بات معمولی اور سیدھی سادی ہو تو ضروری نہیں کہ اس کے لیے تراکیب اور پیچیدہ الفاظ کا استعمال کیا جائے۔ اسلوب میں سادگی اس لیے ضروری ہے کہ زبان کا مقصد ابلاغ ہے یعنی کہ اپنے خیالات اور جذبات کو دوسروں تک منتقل کیا جائے اور اگر اس میں کامیابی حاصل نہ ہو تو تراکیب اور پیچیدہ الفاظ کا استعمال وقت کا ضیاع ہے۔ اردو نثر نگاری میں اگر اس کی مثال لی جائے تو خطوط غالب، حالی کی نثر نگاری اور سرسید کے مضامین میں سادگی کی بہترین مثالیں ہیں۔ زبان کا اصل مقصد اپنے خیالات اور جذبات کو دوسروں تک پہنچانا۔ اگر ہم پیچیدہ الفاظ کا استعمال کریں گے تو جو خیالات ہم دوسروں تک پہنچانا چاہتے ہیں اس کا حق ادا نہیں ہوگا۔

کوئی بھی نثر نگار یا شاعر ہو وہ اپنے خیالات و جذبات کو بیان کرنے کے لیے اسلوب کا سہارا لیتا ہے۔ وہ اپنی بات بیان کرتے وقت مختلف تراکیب، الفاظ اور بندشوں کو استعمال کرتا ہے۔ جن کی بدولت اپنے فکری عناصر کو بیان کر سکے مگر یہاں بات سادگی کی، کی جائے تو وہ کون سا پیمانہ ہے جس کے تحت ہم کسی تحریر کو سادگی کے زمرے میں لا سکتے ہیں۔ اس کے متعلق عابد علی عابد لکھتے ہیں کہ:

> جہاں بنیادی محرک یا فکر کا وہ پہلو جو ادب بنا ہے، سادہ ہوتا ہے اور اس میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں ہوتی۔ سادگی (جسے سلاست اور صفائی بھی کہا جا سکتا ہے) پیدا ہوتی ہے۔ یہاں الفاظ بھی معانی کے لوازم کے پہلو بہ پہلو ہوتے ہیں اور مطلب بالکل واضح ہوتا ہے۔[۱۹]

یعنی نثر میں سادگی کے لیے یہ ضروری ہے کہ الفاظ کے سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے معنی بھی سادہ ہوں کیوں کہ بعض اوقات شاعر یا ادیب الفاظ سادہ استعمال کرتے ہیں جو استعارات استعمال کرتے ہیں وہ بھی آسان اور روزمرہ کے استعمال کرتے ہیں مگر ان کے معنی بہت پیچیدہ ہوتے ہیں۔ معنی اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ عام آدمی انھیں بآسانی نہیں سمجھ سکتا۔ اس کے برعکس کبھی ایسا ہوتا ہے کہ الفاظ تراکیب، علامتی زبان اور استعارات کا بے دریغ استعمال کیا جاتا ہے مگر ان کے معنی بہت آسان ہوتے ہیں۔ ان کے معنی میں سادگی پائی اتی ہے جس سے ایک

عام قاری لطف اٹھا سکتا ہے مگر عابد علی عابد اس نثر کو سادہ کہتے ہیں جس میں الفاظ اور معنی دونوں میں سادگی پائی جائے۔ عابد علی عابد لکھتے ہیں کہ:

> مبتدی فن کار (نثر میں) ایک فقرے کا آغاز کرتے ہیں اور پھر اپنے ذہن میں اپنے مفہوم کی تمام دلالتوں سے ناواقف ہونے کے باعث فقرے پر فقرے لکھے جاتے ہیں کہ ان کی اصل بات محدود ہو جائے اور صفت سے متصف ہو کر اصل کی بنیادی صفت سے معرا ہو جائے۔ [۲۰]

اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے تو کوئی بھی ادبی پارہ بے لطف اور بوجھل محسوس ہوتا ہے۔

کسی نثر میں سادگی سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ اس کے جملے مختصر ہوں اور جلدی سمجھ میں آجاتے ہوں کیوں کہ طویل جملوں سے ابہام کو جنم ملتا ہے مگر گوپی چند نارنگ یہاں سادگی کی صفت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "سادگی کی بنیاد چھوٹے جملوں کے استعمال پر نہیں ہے۔ جملے طویل ہوں مگر اس کے باوجود نثر پیچیدہ یا مشکل نہ ہو۔"[۲۱]

یعنی ان کے نزدیک سادگی سے مراد یہ نہیں کہ جملے مختصر ہوں بلکہ طویل نثر کے باوجود اس میں سادگی کا عنصر پایا جائے۔ وہ طویل جملوں کے باوجود نثر کے پیچیدہ نہ ہونے کے قائل ہیں۔

قطعیت اسلوب کی ایسی صفت ہے جس میں الفاظ پیچیدہ ہوں مگر وضاحت طلب کے اعتبار سے وہ سادگی سے کسی بھی طرح کم نہ ہوں۔ الفاظ و تراکیب کا استعمال ہوتا ہے اور پیچیدہ الفاظ بھی استعمال کیے جاتے ہیں مگر اپنا مطلب قطعیت سے پڑھنے والے تک پہنچا دیا جاتا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کیا کہنا چاہتا ہے۔ ایسا نہیں کہ مصنف ہمیشہ سادہ الفاظ استعمال کرے، اکثر اوقات فکر اور جذبات کے اظہار کے لیے پیچیدہ الفاظ کا استعمال بھی کیا جاتا ہے مگر قطعیت میں یہ خوبی ہے کہ ان پیچیدہ الفاظ کے استعمال کے باوجود مطلب واضح ہو جاتا ہے، قاری کو بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ قطعیت کی خوبی ہے کہ اسلوب چاہے پیچیدہ ہو لیکن وضاحت کے اعتبار سے سادہ ہو یعنی پیچیدہ الفاظ ہونے کے باوجود سادگی کا عنصر پایا جائے۔ عابد علی عابد کے نزدیک الفاظ کا سادہ ہونا ضروری نہیں مگر معنی و مفہوم میں اتنی صلاحیت ہو کہ وہ اپنا مفہوم دے سکیں۔ عابد علی عابد اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

> سادگی کے مقابلے میں قطعیت اسلوب کی وہ صفت خاص ہے جس میں فکر کے سر شتے پیچیدہ اور جذبے کے پہلو دقیق ہوتے ہیں۔ ان کی آمیزش طبعاً ایسے الفاظ کا تقاضا کرتی ہے جو چاہے مغلق اور پیچیدہ ہوں، لیکن وضاحت مطلب کے اعتبار سے وہ کسی طرح سادگی سے کم نہ ہوں، میں قطعیت اسی کو کہتا ہوں اور سادگی سے اس کو ممیز کرتا ہوں۔ [۲۲]

قطعیت کے ذیل میں مثال غالب اور عبد القادر بیدل کی ہے جن کے ہاں ہمیں تشبیہات و استعارات کے عنصر ہمیں ملتے ہیں مگر اس کے باوجود دونوں اپنا مطلب واضح کر دیتے ہیں۔ عابد علی عابد قطعیت کی وضاحت میں کہنا چاہتے ہیں کہ چاہے عنوان مشکل ہو اور اس کا بیان بھی پیچیدہ ہو مگر معنی میں مطلب کی وضاحت ہونا بہت ضروری ہے یعنی مفہوم و معنی میں قطعیت کا عنصر لازم ہو۔

اختصار کلام کی جان ہوتا ہے۔ مصنف یہ نہیں چاہتا کہ پڑھنے والا خواہ مخواہ چیزیں پڑھے جن کے بغیر بھی گزارہ ممکن ہے اور یوں ان کا وقت ضائع نہ ہو۔ یہ کام محنت طلب ہوتا ہے کہ مصنف اصل شکل کو ہی اپنے پاس رکھتا ہے جس میں طوالت نہیں ہوتی۔ اگر طوالت اختیار کی جائے تو قارئین اکتا جائیں گے اور دل چسپی نہیں لیں گے جس سے مصنف کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ اختصار سے قارئین کے لیے تفریح کا سامان مہیا ہوتا ہے جس میں اسلوب دل چسپی کا باعث بنتا ہے۔ اس لیے مصنف کے لیے ضروری ہے کہ کم سے کم الفاظ میں اپنے خیالات اور جذبات کو بیان کرے اور بلا ضرورت اس میں طوالت کا عنصر کار فرما نہ ہونے دے۔ تحریر مختصر ہو اور تمام تر پیغام کے ساتھ مکمل ہو جیسے دریا کو کوزے میں بند کر دیا جائے۔

اختصار سے مراد ہے کم سے کم الفاظ میں اصل معنی کو بیان کیا جائے مگر اس میں تشنگی باقی نہ رہے۔ جب کسی فکر اور خیال کو بیان کیا جاتا ہے تو اس کے کچھ مخصوص الفاظ ہوتے ہیں جو انہی کو بیان کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں جیسا کہ اگر تصوف کی بات کی جائے تو بیان کرنے والا انہی مخصوص الفاظ کا استعمال کرے گا جس سے اس کے موضوع کی مکمل تشریح ممکن ہو مگر اس میں اختصار کا عنصر تب آئے گا جب وہ اس مقصد کے بیان میں کم سے کم الفاظ کرے مگر جو فکر اور خیال وہ دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے اس میں کوئی خلل نہ ہو۔

سید عابد علی عابد نے مزید اسلوب کی صفات کو بیان کیا ہے جن میں زورِ بیان بھی شامل ہے مگر ان کے نزدیک یہ صفت نثر سے زیادہ شاعری میں موجود ہوتی ہے۔ اس ضمن میں وہ مغربی مصنف آگڈن (Ogden) کے نقطۂ نظر کو بیان کرتے ہیں۔ آگڈن کے نزدیک زبان کو استعمال کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تحویلی (Referential) اور دوسرا جذباتی (Emotional) ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

> تحویلی طریقہ، افکار اور اشیا کا حوالہ دینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور جذباتی طریقہ اس غرض سے اختیار کیا جاتا ہے کہ ان افکار و اشیا سے جو جذبات یا خیال پیدا ہوتے ہیں ان کو بروئے کار لایا جائے۔ سائنس اور نثر کی زبان تحویلی ہوتی ہے جب کہ شاعری کی زبان جذباتی۔[۲۳]

عابد علی عابد اس نقطۂ نظر سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی کتاب اسلوب میں اسلوب کی صفت زورِ بیان میں زیادہ تر مثالیں شاعری کی پیش کی ہیں۔ نثر کے متعلق ان کا مختصر سا بیان موجود ہے۔ ان کے نزدیک زورِ بیان اور جوشِ بیان کا رنگ نثر میں ہلکا ہوتا ہے مگر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بہت سے نثر نگار نثر میں بھی جوشِ کلام پیدا کرتے ہیں۔

عابد علی عابد بذلہ سنجی کو اصل ظرافت کا نام دیتے ہیں۔ اسے انگریزی میں Wit کہا جاتا ہے۔ اس کے معنی ہیں لطیفہ گو، ظریف یا خوش طبع۔ انسان کی کمزوریاں، معاشرے کی برائیاں، بے ہودگی اور ریاکاری اکثر طنز کا نشانہ بنتی ہیں۔ طنز اور بذلہ سنجی کی اعلیٰ مثالیں ہمارے ہاں رشید احمد صدیقی اور پطرس کے اسلوب میں پائی جاتی ہیں۔ "مرحوم کی یاد میں" اور "دوستوں کی ریاکاری" اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

تجسیم کے معنی ہیں صاحب مجسم یا مجسم ہونے کی حالت و کیفیت، کسی مجرد شے کو جسمانی شکل و صورت دینا۔ ایسی تحریر جو باقاعدہ ایک وجود رکھے۔ تحریر میں کسی منظر، واقعہ یا جذبات و احساسات کو اس طرح بیان کرنا کہ ذہن میں ایک چیز مکمل طور پر تیار ہو جائے اسے تجسیم کہا جاتا ہے۔ عابد علی عابد تجسیم کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> انگریزی میں Concretness یا تجسیم اس صفت اسلوب کو کہتے ہیں جہاں تمثال اور پیکر تراشے جائیں اور ان باریک خیالوں کو جو ہوا کی طرح لطیف ہیں، الفاظ لطیف کا جسم معنوی بخشا جائے۔ اس سلسلے میں ہم دراصل استعارے کو، جو دراصل مجاز ہے، تجسیم کہتے ہیں۔ [۲۴]

یعنی مصنف کے اسلوب میں یہ صفت تب شامل ہوگی جب وہ اپنے خیالات، سوچ اور فکر کو تمثیل اور مجاز کی بھٹی سے گزارے گا اور اس سے وہ پیکر کو تراشتے ہوئے نئی نئی علامتوں کا استعمال کرے۔

استعارات صرف شعری دنیا میں ہی مستعمل نہیں بلکہ نثر میں بھی ان کو مقام حاصل ہے۔ ناول، افسانوں اور ڈراموں میں اس کا استعمال کر کے تحریر کو دل چسپ بنایا جاتا ہے۔ عابد علی عابد اس ضمن میں سید امتیاز علی تاج (انار کلی) کے اسلوب کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنے اسلوب کو استعارے کی مدد سے دل چسپ بنایا ہے۔

خیال افروزی کی صنف مصنف خود ہی جان سکتا ہے۔ نقاد کے لیے فن پارے سے اس صفت کو پرکھنا مشکل ہے۔ عابد علی عابد خیال افروزی کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

> خیال افروزی کا تاثر اتنا فوری اور شدید ہوتا ہے اور ان کا شعور (Impact) اتنا برق مثال کہ قاری اور سامع ان رموز کو موردِ انتقاد نہیں بناتا، نہ ان دلالتوں اور کیفیتوں کو عقل کی کسوٹی پر کستا ہے۔ وہ تو گویا آنکھیں بند کر کے کچھ کیفیات اور تاثرات کو قبول کر لیتا ہے [۲۵]

تصویریت میں مصنف یا فن کار جو کچھ کہنا چاہتا ہے انھیں تصویروں کے ذریعے تراش کر اور مختلف تمثالوں اور علامتوں کو بروئے کار لاتا ہے۔ چیخوف (Chekhov) کے الفاظ میں:

مصنف (اعلیٰ درجے کا فن کار) چیزوں کو چکھتا ہے، سونگھتا ہے، چھوتا ہے، سنتا ہے اور دیکھتا ہے۔ [۲۶]

مندرجہ بالا اسلوب کی صفات عابد علی عابد کے بیان سے پیش کردہ ہیں۔ اس کے علاوہ اسلوب کی کچھ صفات ایسی ہیں جنھیں گوپی چند نارنگ نے بیان کیا ہے کہ اب ان کی بیان کردہ صفات کو دیکھا جائے گا۔ نثر میں خطاب کے انداز کے حوالے سے گوپی چند نارنگ کہتے ہیں کہ:

ترسیل کے نقطۂ نظر سے نثر نگار تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جنھیں مخاطب یاد رہے یا نہ رہے، اپنی ذات ضرور یاد رہتی ہے، دوسرے وہ جنھیں اپنی ذات یاد رہے یا نہ رہے، مخاطب ضرور یاد رہتا ہے اور تیسرے وہ جنھیں نہ اپنی ذات کا پتہ ہوتا ہے نہ مخاطب کا۔ [۲۷]

یعنی کہ نثر میں مخاطب کو خطاب کیا جانا چاہیے۔ اسی حوالے سے گوپی چند نارنگ بیان کرتے ہیں کہ:

خطاب کا انداز سے مراد محض یہ ہے کہ مخاطب ہر وقت نظر میں رہتا ہے اور متکلم اور مخاطب میں کوئی تیسرا واسطہ نہیں ہوتا۔ [۲۸]

بیانیہ نثر کے حوالے سے گوپی چند نارنگ ایک اقتباس پیش کر کے پھر اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ:

جنگل ہی جنگل تھے اور پھر پہاڑیاں ہی پہاڑیاں۔ ساتویں جنگل کے پیچھے اور ساتویں پہاڑی کے پرے ایک مچھیرا رہتا تھا۔ جوان اور خوب صورت وہیں ایک گدڑیا رہتا تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی جیسے چاند کا ٹکڑا۔ یہ بچی بھیڑیں چرایا کرتی تھی۔ غریب اور بھولی بھالی تھی جیسے اس کی بھیڑیں۔ دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو گئی۔ لڑکی کی نظر میں مچھیرا کسی شہزادے سے کم نہ تھا اور مچھیرے کے نزدیک کوئی شہزادی اس غریب لڑکی کی برابری نہ کرتی تھی مگر تھے دونوں غریب۔ [۲۹]

اب گوپی چند نارنگ اس کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں کہ:

نثر کا عام رنگ بیانیہ ہے لیکن دو باتیں توجہ طلب ہیں، ایک تو یہ کہ انداز کہانی لکھنے کا نہیں، سنانے کا ہے یعنی مخاطب نظر میں ہے اور اندازِ گفتگو کا ہے۔ دوسرے جملے چھوٹے چھوٹے ہیں لیکن عوامی متوازیات یہاں بھی موجود ہیں۔ [۳۰]

اس سے ظاہر ہوا کہ بیانیہ نثر میں ضروری ہے کہ مخاطب نظر میں ہو اور جملے چھوٹے چھوٹے ہوں۔

عام فہم نثر کے لیے ضروری ہے کہ اس میں سادگی پائی جائے اور مخاطب کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ گوپی چند نارنگ کہتے ہیں کہ "طویل جملوں کے باوجود سادہ اور عام فہم ہونا چاہیے۔"[۳۱]

یعنی عام فہم نثر کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ جملے چھوٹے ہوں۔ جملوں میں طوالت کے باوجود سادگی کا ہونا عام فہم نثر کہلائے گی۔

نثری اسلوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں نثر نگار کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنے خیالات کو تحریر میں لا کر دوسروں تک پہنچا دے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تحریر واضح اور قطعی ہو۔ اس میں کسی قسم کی شعریت یا پیچیدہ الفاظ کا استعمال نہ ہو۔ اگر پیچیدہ الفاظ اور تراکیب استعمال کی جائیں تو اس کی تحریر ایسی ہو کہ اس کے باوجود سمجھ میں آ جائے کہ نثر نگار کیا کہہ رہا ہے۔ نثر میں اسلوب کی شناخت بنانا ایک مشکل کام ہے۔ رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور اور ذاکر حسین وغیرہ نے اسلوب کے مختلف انفرادی طریقے اپنا کر ایک منفرد شناخت بنائی ہے۔

شعری اسلوب کا اظہار جذبات کے ساتھ ہے۔ اس میں بلیغ ابہام ہوتا ہے۔ شعری اسلوب میں برجستگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔

کوئی بھی تخلیق ہو، وہ اپنے دور کا آئینہ اور مصنف کی ذات کا عکس بن کر قاری کے سامنے آتی ہے۔ اردو میں خاص طور پر ناول نگاری میں ایسی کئی تخلیقات سامنے آتی ہیں جو اپنے دور کا آئینہ ہوتی ہیں۔ ناول کی ظاہری ہیئت اگرچہ الفاظ سے ہی ہوتی ہے مگر تحریر کی کامیابی کا اسلوب سے بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے۔

ادب میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کئی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ دیگر اصناف کی طرح یہ تبدیلیاں ناول میں بھی ہوتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں کئی طرح کی ہوتی ہیں جن میں اسلوبیاتی تبدیلیاں بھی شامل ہیں۔ اگر ماضی میں دیکھا جائے تو جب علی گڑھ تحریک اپنے قدم مضبوط کر رہی تھی، اس وقت ناولوں میں زیادہ تر اصلاحی پہلو شامل تھے۔ ان کا مقصد ہی قوم کی اصلاح تھا۔ اس کے بعد جب ترقی پسند تحریک وجود میں آئی اور پروان چڑھی تو ناول نگاروں نے حقیقت نگاری پر زور دیا۔ غرض جس عہد میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہوتی ہیں اس سے ادب میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ادب میں کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی انداز میں ضرور بیان کیا جا رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح جیسے جیسے تبدیلیوں نے جنم لیا ناول نگاری میں بھی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔[۳۲]

اسلوب اپنے عہد، اپنی معاشرت اور اس میں رہنے والے لوگوں کے نظریات و عقائد کا عکاس ہوتا ہے۔ ناول ''نولکھی کوٹھی'' میں نوآبادیاتی تناظر میں لکھا گیا ہے۔ اس لیے اس کے کرداروں کی زبان، اس کا ماحول اور اس کے محاورات، تراکیب و ضرب الامثال میں بھی مصنف نے اس خاص سوچ اور فکر کو مد نظر رکھنے کی کوشش کی ہے جو نوآبادیاتی تناظر کو واضح کرتی ہے۔ اس کی مثالیں ہمیں ناول میں جگہ جگہ ملتی ہیں جیسا کہ:

جب بابا جان اور انگریزی سرکار کے افسر جیپوں پر دورے کو نکلتے تو دیسی لوگوں پر کیسی حسرت طاری ہوتی۔ وہ ان کی تمکنت کو سڑک کنارے کھڑے پچکے ہوئے چہروں پر تکی اور بھنچی ہوئی بے نور آنکھوں سے تکتے رہ جاتے۔ یہاں تک کہ جیپ رناٹے سے ان کے سروں پر خاک پھینکتی ہوئی نکل جاتی۔ اسے یاد آیا، جب وہ اپنے والد کے دفتر جاتا تو کس طرح آفس میں کام کرنے والا عملہ خوشامد کو آگے بڑھتا۔ چاکلیٹ اور مٹھائیوں کے ڈھیر لگ جاتے۔ [۳۳]

علی اکبر ناطق کو ماحول کی منظر کشی کرنے میں مہارت حاصل ہے۔ ناول میں اس طرح منظر کشی کرتے ہوئے اس عہد کو بیان کیا ہے کہ انسان اس عہد کی فضا میں پہنچ جاتا ہے اور اس سے قاری کا حسِ لطیف بھی متاثر ہوتا ہے۔ ناطق نے اس طرح سے ماحول کی منظر کشی کی کہ قاری خود کو اس کا حصہ تصور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اس وقت کے لوگوں کے حالات و واقعات خود بخود اس کے ذہن میں سمو رہے ہوتے ہیں کہ کس طرح انگریزوں نے ہندوستانی عوام کا استحصال کیا اور ان کے حقوق پہ ڈاکا ڈالا کہ جن چیزوں پر ان کا حق تھا، اسے عیش و عشرت سے انگریز حکمران استعمال کر رہے تھے اور ہندوستان کی عوام اسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہتی تھی۔ ماحول اور سماج کے حالات بڑے موئثر انداز میں ناول میں دکھائے گئے ہیں۔ ناول نگار نے کرداروں کے مزاج اور عادات کے علاوہ سماجی و معاشرتی مسائل کی بھی تصویر کشی کی ہے۔ ناول نگار کا فرض ہے کہ جس طرح کا ماحول دیکھے ایسا ہی من و عن بیان کرے، قاری کو بھی ویسا ماحول دکھائے۔ اس ناول میں علی اکبر ناطق نے ماحول کی تصویر کشی جس انداز میں کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہیں مثلاً

گورنمنٹ کی نوکری میں اتنی ہیبت ضرور تھی کہ غلام حیدر کے ساتھ آیا ہوا جوانوں کا دستہ تھانیدار کے آگے باادب ہو ہی گیا۔ یہ رعب ان پر دیسی ملازمت کا نہیں بلکہ انگریز سرکار کا تھا۔ جس کا ایک پیادہ گاؤں میں چلا جاتا تو پورا گاؤں خوف کے مارے چوہوں کی طرح اپنے بلوں میں گھس جاتا۔ [۳۴]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز حکومت کا ہندوستانی عوام پر کتنا رعب تھا اور انھیں کیسے ڈرا دھمکا کر رکھا ہوا تھا اور اس ڈر اور خوف کا فائدہ اٹھا کر ہندوستان کو لوٹا جاتا رہا۔ اس حکومت کا ایک شخص کسی گاؤں میں چلا جاتا تو پورے گاؤں میں خوف طاری ہو جاتا تھا۔

ناول میں نو آبادیات کی تصویر کشی ہمیں جگہ جگہ دکھائی دیتی ہے کہ کس طرح انگریز ہندوستان میں آئے اور ہندوستان کی سرزمین دیکھ کر اس کی لالچ کرنے لگے۔ اپنی تمام تر محرومیوں کو پورا کرنے کے لیے اس پر قابض ہونے کے خواب دیکھنے لگے اور اپنے اس ارادے میں کامیاب ہو کر ہندوستان کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ ہندوستانی سال

کو اپنے لیے استعمال کرنے لگ گئے۔

انگریز نے برطانیہ کے تنگ رقبے اور لندن کے چھوٹے چھوٹے فلیٹس کا غصہ ہندوستان کی دور تک پھیلی ہوئی ہموار زمینوں پر نکالا تھا۔ تنگ گلیوں اور کوارٹروں سے نکلنے کے بعد اس نے اتنی کھلی زمینیں اور رقبے بے مصرف پڑے دیکھے جس کا تصور بھی یورپ نہیں کر سکتا تھا تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ انھوں نے وہ سارا احساس محرومی یہاں نکالا۔[۳۵]

اس اقتباس سے ہمیں اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت یورپ کے کیا حالات تھے۔ وہاں کی تنگ گلیاں اور چھوٹے چھوٹے گھروں سے نکل کر جب انگریز ہندوستان آئے تو یہاں حالات بالکل مختلف تھے۔ یہاں کھلی کھلی حویلیاں، ہندوستانیوں کے کئی کئی رقبے زمینیں دیکھ کر انگریزوں سے رہا نہ گیا، کیوں کہ انھیں یورپ میں یہ سب میسر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یورپ میں وہ چھوٹے چھوٹے فلیٹس میں اپنی پوری زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہندوستان میں وسائل کی بہتات دیکھ کر ان میں لالچ پیدا ہوئی اور انھوں نے ان سب پر قبضہ کرنے کی ٹھان لی۔ جب وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوئے تو جس قدر وہ احساس محرومی کا شکار تھے اسی قدر انھوں نے ہندوستان کو لوٹنا شروع کر دیا۔ ہندوستان میں بڑی بڑی کوٹھیاں بنانے لگ گئے۔ جس کا یورپ میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

علی اکبر ناطق کے اسلوب کی ایک خوبی طنز بھی ہے۔ اس ترکیب کا استعمال ناول میں کئی جگہ کیا گیا ہے۔ اس سے ناول قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ ناول میں طنز و مزاح سے قاری کے دل میں اسے پڑھنے کی دل چسپی بڑھتی ہے۔ ناول میں نو آبادیاتی کے تناظر میں اگر ہم طنز کو دیکھیں تو اس کی ہمیں کئی مثالیں ملتی ہیں جو درج ذیل ہیں:

پنجاب واحد ایسا علاقہ ہے جہاں انسان جانوروں کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس لیے اکثر پتا نہیں چلتا، دونوں میں اصل جانور کون ہے؟ ان لوگوں کے پاس بیل اور بھینسیں بہت ہوتی ہیں۔ یہ لوگ اطاعت کے وقت بھینسیں اور سرکشی کے وقت بیل بن جاتے ہیں۔[۳۶]

پنجاب میں دیہی علاقوں کا جائزہ لیا جائے تو بہت کم ایسے لوگ ہیں جنھوں نے جانوروں کے لیے الگ باڑا بنایا ہوتا ہے۔ زیادہ تر لوگوں نے جانوروں کو گھروں میں رکھا ہوتا ہے۔ جانوروں کو گھروں میں پالا جاتا ہے کیوں کہ ان کے پاس اتنی استطاعت نہیں ہوتی کہ وہ لوگ باڑا بنائیں۔ اس لیے وہ انھیں اپنے ساتھ گھروں میں رکھ لیتے ہیں۔ پنجاب کے لوگوں کی اس بات کو طنز کا نشانہ بنایا گیا کہ وہ اور ان کے جانور ایک ہی جگہ پر رہتے ہیں۔ اسی لیے ہم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ دونوں میں سے اصل جانور کون ہے کیوں کہ کبھی جب ان لوگوں نے اطاعت کرنی ہوتی ہے تو بھینس کی طرح بن جاتے ہیں اور جب انھوں نے نافرمانی کرنی ہوتی ہے تو بیل جیسا روپ اختیار کر لیتے ہیں جیسے بیل کسی کو آگے نہیں جھکتا اور نقصان پہنچانے لگ جاتا ہے۔ ان لوگوں کا بھی وہی حال ہوتا ہے۔ یہاں ہندوستانی عوام اور

جانوروں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر کے ان پر طنز کیا گیا ہے۔ نو آبادیات میں محکوم قوم کو کم تر سمجھا جاتا ہے مگر یہاں تو انسانوں کو جانوروں کے ساتھ لا کھڑا کیا۔ ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

> جگبیرے تیرے جیسے بارہ تالیے شراب کے چوہے ہوتے ہیں، جو دو گھونٹ چڑھا کر اپنی دم پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور شیر کو للکار دینا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔[۳۷]

اس اقتباس میں جگبیرے پر طنز کیا گیا ہے کہ تمھارے پاس کچھ ہو نہ ہو، ایسے شخص سے دشمنی مول لے لیتے ہو، جس کا تم مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

> شیخ صاحب مجھے تو اپنے تجربے سے کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ مسلمان اور سکھ الگ الگ دماغ کے مالک ہیں۔ بس داڑھیوں کی لمبائی میں فرق ہے۔ آپ فکر نہ کریں، دونوں عقل کے ایک ہی قبیلے سے منسلک ہیں۔[۳۸]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو دو قومیں ہندوستان میں رہ رہی ہیں۔ ان کی ذہانت کی بنا پر انھیں کمتر سمجھا جاتا رہا ہے۔ اگر ہم نو آبادیات کے تناظر میں اسے دیکھیں تو جس طرح محکوم قوم کو کم تر سمجھا جاتا ہے انھیں کم عقل سمجھا جاتا ہے اور یہاں تک کہ ان کے مذہب کو بھی کم تر سمجھا جاتا ہے۔ یہ اس تناظر میں پورا اترتا ہے۔ وہاں رہنے والے سکھوں اور مسلمانوں کی عقل کو کم تر سمجھنے کے ساتھ ساتھ ان کے مذہب پر بھی بات کی گئی۔ دونوں کو کم تر سمجھتے ہوئے ایک ہی کسوٹی پر پرکھا گیا۔ ایک اور مثال ملاحظ ہو:

> نیاز دین نے ایک کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ولیم کو داد طلب نظروں سے دیکھا مگر ولیم کا چہرہ سپاٹ رہا۔ وہ بغیر کچھ کہے واش روم کی طرف مڑ گیا۔ نیاز دین کو سلیم کے اس عمل سے تھوڑا سا دکھ ہوا لیکن زیادہ تعجب نہ ہوا کیوں کہ وہ اس ریسٹ ہاؤس میں کئی برسوں سے چوکیدار ہونے کے سبب انگریز افسروں کے سپاٹ رویوں کا عادی ہو چکا تھا۔[۳۹]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں کے مقامی لوگوں کے ساتھ کس طرح کا رویہ رکھا جاتا جیسے نیاز دین اسے داد طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا مگر ولیم نے ایک مسکراہٹ تک نہ دی اور واش روم چلا گیا۔ نیاز دین کو دکھ ہوا مگر اس کے لیے یہ کوئی پہلی دفعہ نہیں ہوا تھا۔ یہاں کئی برسوں سے انگریز آتے رہتے تھے اور ہر ایک کا یہی رویہ ہوتا تھا۔ اس لیے وہ اس چیز کا عادی تھا کہ انگریزوں سے اسے کوئی داد نہیں ملنے لگی۔ ایک اور مثال ملاحظہ کریں:

> ولیم تمھیں انگلستان کی برف ہندوستان کے گرم دریاؤں سے اور لندن کے سفید کولے آگرہ کے کبوتروں سے زیادہ عزیز ہونا چاہیے۔[۴۰]

نو آبادیات میں حاکم قوم کے افسر اپنے ساتھیوں کو ہمیشہ یہ بات ذہن نشین کراتے ہیں کہ وہ جہاں حکومت

کر رہے ہیں وہاں وہ کسی ارادے کے تحت آئے ہیں اس ارادے کو بھولنا نہیں ہے۔ اس سے ان کے ذہنوں میں ہمیشہ یہ بات رہتی ہے کہ وہ یہاں کس غرض سے آئے ہیں۔ اسی طرح ناول میں بھی ہیلے ولیم کو یہ سمجھاتے ہوئے نصیحت کرتا ہے کہ تم یہاں کے قدرتی مناظر میں کھوئے رہتے ہو حالاں کہ یہاں کی زمین سے زیادہ تمھیں انگلستان کی زمین سے محبت ہونی چاہیے۔[۴۱]

علی اکبر ناطق نے کہیں کہیں طنز پر اسلوب سے بھی کام لیا ہے۔ ان کے طنز کی یہ خوبی ہے کہ اس میں تصنع نہیں پایا جاتا، بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ نو آبادیاتی نظام میں زندگی کی ناہمواریاں عام تھیں۔ نچلے طبقے کو ان کے حقوق نہیں دیے جاتے تھے۔ ہندوستان عوام کو انگریزوں نے غلام بنایا ہوا تھا۔ انھیں حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ جہاں کہیں موقع ملتا تھا ہندوستانی عوام کو نیچا دکھانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس کی کئی مثالیں اوپر دی جا چکی ہیں کہ کس طرح ہندوستانی عوام کو کم تر سمجھا جاتا تھا اور ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا تھا۔

نو آبادیاتی نظام کا یہ عنصر کہ محکوم قوم کو سست، کاہل اور ذہنی طور پر خود سے کم تر سمجھا جاتا ہے۔ اس کی کئی مثالیں ہمیں ناول "نولکھی کوٹھی" میں ملتی ہیں۔ علی اکبر ناطق نے جس انداز میں اس طنز کے ذریعے اس دور کے حالات و واقعات کو پیش کیا ہے اس میں صرف طنز ہی نہیں بلکہ شدید کرب کی جھلکیاں بھی نمایاں ہوتی ہیں۔ اس طنز میں تاریخی حقائق کا عکس موجود ہے۔ ناول میں مختلف کرداروں کے قول و فعل اور وقت کے ساتھ ساتھ نظریات تبدیل ہونے کے عمل میں جو طنز کار فرما ہے، اسے اہلِ نظر بخوبی محسوس کر سکتے ہیں۔ مقامی لوگوں کو سست اور کاہل کہا جاتا، اسے کبھی آب و ہوا اور فطری ماحول سے منسوب کیا جاتا کہ اس وجہ سے یہاں کے لوگ کاہل ہیں اور کبھی کہا جاتا کہ سیاسی و سماجی اثرات کی وجہ سے ہندوستانی عوام غلام بننے کی عادی ہو چکی ہے۔ اس لیے ہم ان کی بہتری کے لیے ان کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ اس طرح انگریز حکمران ان سے غلاموں جیسا سلوک کرتے اور انھیں ذلت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔[۴۲]

نو آبادیاتی نظام میں نو آبادکار اپنی عوام کے دل میں اپنے وطن کی محبت کو جگائے رکھتے ہیں جیسے انگریز ہندوستان آئے تو انگریز حکمران اپنی عوام میں برطانیہ کی محبت کو ختم نہ ہونے دیتے اور انھیں ہمیشہ یہی احساس دلاتے کہ ہم یہاں حکومت کرنے آئے ہیں۔ ان سے عزیز ہمیں اپنا ملک ہے۔ اس کی مثال بھی ناول میں ملتی ہے جیسے ولیم کو ہیلے طنزیہ انداز میں سمجھاتا ہے کہ اس کے نزدیک انگلستان کی وہ برف ہندوستان کے دریاؤں سے زیادہ عزیز ہونی چاہیے۔ اس طنز کے پیچھے وہ دراصل ولیم کو یہ بات سمجھارہا ہوتا ہے کہ یہاں کی آب و ہوا اور نظاروں میں اتنا مگن نہیں ہونا کہ اصل مقصد ہی بھول جاؤ کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں اور ہمارے لیے کیا چیز زیادہ عزیز ہے۔

علی اکبر ناطق کے اسلوب کی ایک خوبی منظر نگاری ہے۔ منظر نگاری کا نرالا انداز علی اکبر ناطق کے ہاں موجود ہے۔ وہ منظر نگاری کرتے ہوئے جزئیات کو بیان کرتے ہیں مگر اس کے لیے وہ غیر ضروری تمہید نہیں باندھتے بلکہ چند جملوں میں بڑی فن کاری کے ساتھ منظر نگاری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ "نولکھی کوٹھی" کے ڈائننگ ہال کی منظر نگاری کچھ اس انداز میں کی گئی ہے:

> ڈائننگ ہال کم از کم تیس فٹ لمبا اٹھارہ فٹ چوڑا اور پچیس فٹ اونچی چھت پر محیط تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے طاق اور طاقوں میں سجے ہوئے فانوس، جھاڑو اور آتش دان لگے تھے۔ آتش دان کی خاص ضرورت تو نہیں تھی، کبھی کبھی ہی سخت سردی میں جلتا تھا لیکن انگریزی طرزِ تعمیر کے مطابق اس کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ کمرے کے درمیان میں ایک بڑی صندلی ٹیبل جس پر ریشمی دستر خوان اس طرح بچھا تھا کہ اس کے کنارے نیچے پاؤں تک چھوتے تھے۔ چھت پر لٹکے ہوئے فانوس اور ان کے درمیان بجلی کے پنکھے ڈائننگ ہال کو ایک نوابی شان سے دوچار کرتے تھے۔ بجلی رینالہ بجلی گھر بن جانے سے کافی مقدار میں دستیاب تھی۔ اس لیے بعض اور بھی چیزیں بجلی پر چلنے والی مہیا کی گئیں جن میں سے اکثر اسی ڈائننگ ہال اور ڈرائینگ روم میں موجود تھیں مثلاً گراموفون، ریکارڈ سسٹم، بھاپ دان، کھانا پکانے کے لیے ہیٹر اور اسی طرح کی بیشتر چیزیں، ڈائننگ ہال میں بچھا ہوا قالین بھی اپنی مثال آپ تھا۔ [۳۴]

اس اقتباس سے ہم "نولکھی کوٹھی" کے ڈائننگ ہال کی خوب صورتی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ علی اکبر ناطق نے اس کی جس انداز میں منظر نگاری کی ہے۔ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور ان کے ایک ڈائننگ ہال سے اندازہ لگائیں تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے ہندوستان کو کتنا لوٹا۔ جہاں وہ چھوٹے چھوٹے فلیٹس میں رہتے رہے جب ہندوستان آئے تو اپنی تمام تر محرومیوں کو پورا کرنے کے لیے ملک کو لوٹتے رہے۔ ہندوستانی عوام کا استحصال کر کے اتنے عالی شان ڈائننگ ہال بنائے تو جس کوٹھی میں یہ ڈائننگ ہال ہوگا اس کوٹھی کی کتنی خوب صورتی ہوگی اور یہ تمام تر خوب صورتی ہندوستانی عوام کے حقوق کا استحصال کر کے، ان کے وسائل کو اپنے مفاد میں استعمال کر کے حاصل کیا گیا۔

اسی ملک میں مقامی لوگوں کے کھانے کو کچھ نہ ہوتا اور انہی مقامی لوگوں کے وسائل کو لوٹ کر ان کا استحصال کر کے انہی کے ملک میں راج کر رہے تھے اور مقامی لوگوں کو غلام بنائے رکھا۔ ہندوستان کے ماحول اور دیہات کے ایسے دل کش مناظر ناول میں بیان کیے گئے ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں۔ جنھیں پڑھتے ہوئے قاری کو اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز کیوں کر ہندوستان کی سرزمین پر اپنے قدم جمانا چاہتے تھے۔ ہندوستان میں انگریز راج

اور پنجاب کے کلچر کو جس طریقے سے بیان کیا گیا ہے، وہ روایتی انداز سے بالکل مختلف ہے۔ منظر نگاری کی چند مثالیں اور پیش کی جاتی ہیں۔

> ہیلے کی میز اور کمرے کی اندرونی ہیت واقعتاً برطانوی ایمپائر کی ہیت کی عکاس تھی۔ دس فٹ لمبی اور چھ فٹ چوڑی میز کے ایک کونے پر رکھا ہوا گلوب کچھ معنی رکھتا تھا۔ کمرہ انتہائی کھلا اور آرائش میں پُروقار چیزوں کی نشان دہی کر رہا تھا۔ پردوں سے لے کر صوفوں تک اور سامنے کی دیوار پر برطانیہ کی وسیع سلطنت کے پھیلے ہوئے نقشے کسی بھی ملاقاتی کے دل پر حکومت کی جلالت اور اس کے نمائندے کی ہیبت پیدا کرنے کے لیے کافی تھے۔ [۴۴]

مندرجہ بالا اقتباس میں انگریز افسر کے دفتر کی منظر کشی کی گئی ہے۔ اس نے اپنے کمرے کو ایسا رنگ دیا ہوا تھا کہ جب کوئی شخص اس سے ملاقات کے لیے اس کمرے میں داخل ہوتا تو وہ ایک دفعہ کمرے کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا۔ ان پر انگریز حکومت کی وحشت طاری ہو جاتی اور وہ پہلے سے بات کرتے ہوئے بھی جھجکنے لگتا۔ یہ منظر جو بیان کیا گیا ہے ہندوستان میں تھا مگر اس کمرے کی دیوار پر جو نقشہ لگا ہوا تھا وہ ہندوستان کا نہیں بلکہ برطانیہ کا تھا۔ اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ ہندوستان کی سرزمین اور اس کی عوام کے ساتھ کتنے مخلص تھے۔ انھوں نے ہندوستان میں جو کوٹھیاں اور دفاتر قائم کیے تھے جن میں وہ عیش کرتے تھے انھیں مقامی لوگ دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔

جہاں ہندوستان میں ایک طرف اتنے عالی شان کمرے اور کوٹھیاں بنائی ہوئی تھیں وہیں ہندوستان میں جو گاؤں تھے ان کی حالت بہت خراب تھی۔ انگریز حکومت نے ان پر توجہ نہ دی بلکہ صرف اپنے مفادات کو سامنے رکھا۔ گاؤں کا ایک منظر ملاحظہ ہو:

> گاؤں کی گلیاں بہت تنگ تھیں، جو کچی ہونے کے ساتھ ساتھ کہیں کھائی اور کہیں سے ٹیلے کی طرح تھیں۔ ویسے بھی گلیوں کی کوئی خاص ترتیب نہیں تھی۔ ادھر ادھر مڑتی ہوئی بھول بھلیوں کی سی شکل اختیار کر لیتیں۔ بارش کے وقت جن میں گزرنا ایک ناممکن سا عمل ہوتا۔ البتہ ہر گھر میں ایک آدھ درخت ضرور تھا جن میں زیادہ تعداد لسوڑوں کی تھی۔ گلیاں اتنی تنگ تھیں کہ ان میں کسی درخت کا ہونا مشکل تھا۔ البتہ پورا گاؤں ٹاہلیوں کے جنگل کے درمیان گھرا تھا، جن کے نیچے گاؤں والے مال مویشی اور بھیڑ بکریاں باندھ لیتے۔ [۴۵]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز حکومت نے ہندوستانیوں کے حقوق کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ معاشی و معاشرتی طور پر ان کا استحصال کیا اور اپنی تجوریاں بھرنے میں مصروف رہے۔ حالاں کہ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ ہندوستان پر حکومت اس لیے کر رہے ہیں کہ ان کی حالت کو بہتر کر سکیں۔

گویا علی اکبر ناطق کو منظر کشی کرنے میں مہارت حاصل ہے۔ ناول میں وہ فطری حسن کی خوبیوں کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ قاری خود کو اس کا حصہ تصور کر لیتا ہے۔ اس سے ناول میں دل چسپی کا عنصر موجود رہتا ہے۔ نو آبادیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ناول میں کئی جگہ منظر کشی ایسے انداز میں کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریز وہاں کتنی عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ انگریزوں کے گھروں، بنگلوں اور دفتروں سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ہندوستان آکر اپنی تمام تر خواہشات کو پورا کیا۔ ہندوستانی عوام کا استحصال کر کے اپنی تجوریاں بھرتے رہے اور عالی شان زندگی گزارتے رہے۔ یہاں تک کہ ہندوستانی عوام، ان کے رہن سہن کو دیکھ کر احساس کمتری کا شکار ہوتی مگر درحقیقت یہ ان کا حق تھا۔

ناول میں ضرب الامثال اور محاورات کی تراکیب کو بھی استعمال کیا گیا۔ ناول نگار نے بڑے عمدہ طریقے سے انھیں ناول میں پیش کیا۔ علی اکبر ناطق نے اپنے ناول میں ایسا انداز تحریر اپنایا جو منفرد ہے اور قدیم سرمائے سے بالکل مختلف ہے۔ ناول میں سیاسی، سماجی، تہذیبی، تعلیمی اور اخلاقی مسائل کو بھرپور معنویت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ نو آبادیاتی تناظر میں ضرب الامثال اور محاورات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

> گورنمنٹ اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ جس مٹی سے تم سو روپیہ نکالو تو اس میں سے بیس روپے اسی مٹی پر ضرور خرچ کرو تاکہ مزید سو روپے نکال سکو۔ یہ طریقہ اسی مرغی کی مثال ہے جسے آپ ایک دمڑی کا دانہ دے کر درجن انڈے لیتے ہیں۔ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ ہندوستان ایسی مرغی نہیں جو کڑک ہو اور ہمیں انڈے دینے سے انکار کر دے۔[۴۶]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز حکومت ہندوستان کے وسائل سے استفادے کے لیے کیا کیا سازشیں اور تدبیریں اختیار کرتی تھی۔ وہ ہندوستان میں اگر کوئی ایسا کام کرتے تھے جس سے ہندوستان کی زمین کو فائدہ ہو تو یہ ہندوستان کے لیے نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اس نیت سے کیا جاتا تھا کہ اگر ایسا کریں گے تو اس سے زیادہ ہمیں فائدہ حاصل ہو گا۔ اگر ہم نے مسلسل ہندوستان کی زمین سے فائدہ حاصل کرنا ہے تو تھوڑا بہت خرچ ہمیں اس پر بھی کرنا ہو گا۔ ان پر خرچ کریں گے تو اپنی تجوریاں بھری جا سکتی ہیں۔ دوسری طرف ہندوستانی عوام کے سامنے یہ ظاہر کیا جاتا تھا کہ ہم تمھارے خیر خواہ ہیں اور یہ سب ہم اس لیے کر رہے ہیں کہ تم لوگ تاریکی سے نکلو اور ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکو۔ اس کے علاوہ محاورات و ضرب الامثال کی اور بھی مثالیں ملتی ہیں جیسے:

> انگریزی قانون ایک بم ہے اسے جس گدھے نے دولتی ماری، اس کے پرخچے اڑ گئے۔ تم نہیں جانتے مگر میرا تجربہ بتاتا ہے کہ انگریز اپنے قانون میں کسی کی مداخلت جائز سمجھ لیتا تو ہندوستان میں ایک لمحے کے لیے راج نہ کر سکتا۔[۴۷]

انگریزوں نے مقامی لوگوں کو کبھی یہ حقوق نہیں دیے تھے کہ ان میں سے کوئی بھی قانون میں مداخلت کرتا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی ہندوستانی کسی فیصلے میں بولتا تو بھی انھیں یہ کہہ کر چپ کروادیا جاتا کہ یہ اختیار صرف ہمیں ہے تمھیں فیصلے کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے اور یہ سب انگریز حکومت اس لیے کرتی تھی کہ ہندوستانیوں پر ان کا رعب قائم رہے اور انھیں حکومت کرتے ہوئے کسی قسم کی رکاوٹ کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اگر ہندوستانیوں کو قانون میں عمل دخل کا اختیار دے دیا جاتا تو ہندوستان میں کبھی بھی وہ اتنا عرصہ اپنی حکومت قائم نہ رکھ سکتے۔

نوآبادیاتی نظام میں حاکم اور محکوم میں ایک فرق ہوتا ہے جسے استعمار کار ہمیشہ برقرار رکھتا ہے تاکہ انھیں اس بات کا احساس ہو کہ ہم ان سے کم تر ہیں۔ ناول میں ایسا اسلوب اپنایا گیا ہے جس سے حاکم اور محکوم کے فرق کو واضح محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے فرق کو واضح طور پر ناول میں پیش کیا گیا ہے۔ ناول کی پوری فضا نوآبادیاتی اثر رکھتی ہے۔

> ملزموں کو نہایت بے دردی سے پیٹا بھی جارہا تھا کہ ان پر انگریزی قانون کو اچھی طرح سے دہشت طاری ہوجائے اور مکمل خوف وہراس پھیل جائے۔[۴۸]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں پر کس قدر ظلم کیا جاتا تھا۔ ملزموں کو اس لیے نہیں مارا جاتا تھا کہ وہ سدھر جائیں بلکہ اس لیے مارا جاتا تھا کہ ان پر انگریز حکومت کا خوف طاری ہوجائے اور مکمل خوف وہراس پھیلے گا تو کوئی دوبارہ ایسی حرکت نہیں کرے گا جس سے ہمیں اپنا ارادہ پورا کرنے میں کوئی مشکلات پیش نہیں آئیں گی۔ ان پر اپنی دھاک بٹھانے کے لیے انھیں بے دردی سے مارا جاتا تھا۔ ایسا اس لیے بھی تھا کہ وہ دنیا کے سامنے ایک مثال قائم کرنا چاہتے تھے کہ ہم نے اس ملک کو کتنی ترقی دی اور امن کی فضا قائم کی۔ ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

> ان مقامیوں کے سیاہ رنگ کے چہرے، گال پچکے ہوئے اور سکڑی ہوئی کالی ٹانگیں بتارہی تھیں کہ غلاموں کی حقیقی تصویر انھی لباسوں میں بنتی ہے۔ انھیں دیکھ کر ولیم نے ایک لمحے کے لیے خداوند یسوع مسیح کا شکریہ ادا کیا کہ اس کی رگوں میں بہر حال انگریزی خون دوڑتا ہے۔[۴۹]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں کو خود سے کم تر سمجھا جاتا اور انھیں اسی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ انھیں دیکھ کر یہی سوچا جاتا کہ درحقیقت یہ غلام ہیں تو غلام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ناول میں علی اکبر ناطق نے ان نوآبادیاتی عناصر کو جگہ جگہ پیش کیا ہے اور انگریزوں اور ہندوستانیوں کی عادات اور رویوں سے ان میں فرق کو واضح طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ فرق نوآبادیاتی نظام کے تحت ہے۔

ناول کی فضا پوری کی پوری نوآبادیاتی نظام میں گھری ہوئی ہے۔ نوآبادیاتی نظام کا ایک ایک پہلو ناول میں مختلف حالات وواقعات کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ انگریزوں کو اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ وہ یہاں ہندوستانی عوام

کی حفاظت کرنے نہیں آئے بلکہ ان پر حکومت کر کے انھیں لوٹ رہے ہیں مگر ہندوستان میں ایسا طبقہ بھی موجود تھا کہ جنھیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ ان پر کون حکومت کر رہا ہے اور جو حکومت کر رہا ہے وہ ہندوستان کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہے۔ وہ اتنے سادہ اور شریف لوگ ہیں کہ انگریزوں کی خدمت بھی بنا لالچ کے کر رہے ہیں۔

ولیم پر کافی عرصے کے تجربات سے یہ بات تو ثابت ہو چکی تھی کہ عام پنجابیوں یا ہندوستانیوں کو، چاہے وہ سکھ تھے یا مسلمان، اس سے کچھ غرض نہیں تھی کہ ان پر کون حکومت کر رہا ہے اور یہ کہ حکومت کرنے والے کا مذہب کیا ہے اور وہ کس نسل سے ہے؟ اسے تو ان عام لوگوں سے امن اور محبت ہی کی خوشبو آئی تھی، وہی محبت اس بوڑھی خاتون اور گڑ بنانے والے اس کے بیٹوں میں نظر آ رہی تھی۔ یہ سوچ کر ولیم کو وہ ہندو، مسلمان اور سکھ اشرافیہ کا خیال آ گیا، جو ان سادہ لوحوں کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اسی طرح ان کا استحصال کرتے ہیں جس طرح غیر ملکی ان کا خون نچوڑتے ہیں۔

انگریزی حکومت کو اپنے اس ظلم کا علم تھا مگر اس نے حکومت کرنی تھی، انھیں ہندوستانیوں کی محبت سے غرض نہیں تھی، انھیں ہندوستان کے وسائل سے غرض تھی جس سے وہ بھرپور فائدہ اٹھا رہے تھے۔

ناول میں تقسیم ہند کی تصویر بھی دکھائی گئی ہے اور ایسی دردناک تصویر دکھائی گئی کہ جیسے ہمارے مسلمانوں کی قربانیوں کا ہمیں احساس دلایا جا رہا ہو کہ کس کرب سے گزر کر ہمیں الگ وطن نصیب ہوا۔ انھیں کس طرح کی مصیبتوں اور پریشانیوں سے گزرنا پڑا۔ آزادی حاصل کرنے کے لیے جو قربانیاں دی گئیں ان کا تذکرہ جس کرب ناک کیفیت سے کیا، اس سے جسم میں رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

چلتے چلتے ایک جگہ سے قافلہ گزرا تو دیکھ کر حیران رہ گئے، نہر بنگلہ، جسے ولیم کے نہری عملے نے بنایا تھا، کی پٹڑی پر چار میل تک لاش کے ساتھ لاش جوڑ کر اس طرح رکھی ہوئی تھی کہ ایک مرد کی لاش، اس کے بعد عورتوں کی لاشیں پھر مرد کی لاش تھی۔ کسی کا گلا کٹا تھا، کسی کے جسم کا کوئی اور عضو کٹا تھا، خون اور مٹی میں لتھڑی ہوئی ان کہی ہزاروں لاشوں کا سلسلہ دور تک اس طرح پھیلا ہوا تھا کہ ان کو دیکھ کر قافلے کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور وہ سوچنے لگے، اگر غلام حیدر ساتھ نہ ہوتا تو ان کی بھی یہی حالت ہوتی۔ یہ سب لاشیں مسلمانوں کی تھیں جن کے اوپر پاؤں رکھ کر اور ان کو روند کر اس قافلے نے چار میل کا فاصلہ طے کیا۔

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقسیم ہند کے وقت ہندوستانیوں کو کس قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ انھیں اپنی جانیں اور اپنی عزتیں گنوانی پڑیں۔ جب ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں ہجرت کی جا رہی تھی تو کسی کو اس بات کا یقین نہیں ہوتا تھا کہ وہ سلامت اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے یا نہیں۔ ایک لاش کو دیکھ کر برداشت نہیں ہوتا اور چار میل کے فاصلے پر مسلسل لاشوں کے اوپر سے پھلانگ کر جانا ایک بھیانک منظر پیش کرتا ہے۔

تقسیم ہند کے وقت صرف ہندوؤں نے ظلم نہیں ڈھائے تھے جس کے بس میں تھا اس نے ظلم کیا، جو علاقے ہندوؤں کے حصے میں آئے وہاں مسلمانوں پر تشدد کیا گیا اور جو علاقے مسلمانوں کے حصے میں آئے وہاں ہندوؤں پر ظلم ڈھائے گئے۔ ہندوؤں کی ظلم کی تصویر تو ہم نے دیکھی مگر مسلمانوں نے بھی ایسا ہی سلوک کیا تھا۔ ناول میں ہندوؤں کے تشدد کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی کی گئی زیادتیوں کو بھی قلم بند کیا گیا ہے۔

> زمان خان نے مجمع کی یہ حالت دیکھی تو سرخ لوہے پر ایک اور ضرب لگائی، بھائیو ان بے غیرتوں نے جو ہمارے ساتھ کیا، وہ تو الگ بات ہے لیکن مجھے ایک اور اندیشہ ہے کہ یہ لوگ، جو اس گاڑی میں بیٹھے ہندوستان جارہے ہیں اور تم انھیں دامادوں کی طرح بڑی عزت سے وہاں بھیج رہے ہو۔ یہ جاتے ہی ان شر نار تھیوں کے ساتھ مل جائیں گے اور تمھارے دوسرے مسلمان بھائیوں کا صفایا کر دیں گے۔[۵۰]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف ہندوؤں کے علاقے میں ہی ظلم نہیں ڈھائے جارہے تھے بلکہ جو علاقے مسلمانوں کے حصے میں آئے، ان علاقوں میں ہندوؤں پر ظلم کیا جارہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی زندگیوں سے خون کی ہولی کھیل رہے تھے۔ جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہاں ہندوؤں پر ظلم کیا جارہا تھا۔ ہندو اور مسلم دونوں ایک دوسرے کی ہجرت میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کی جانوں کے پیاسے ہو گئے تھے۔

ناول کی وری فضا نو آبادیاتی نظام میں لپٹی ہوئی ہے۔ ناول کے کرداروں سے لے کر ناول کے حالات و واقعات، مکالمے، سیاسی و سماجی تغیرات غرض ہر پہلو میں ہمیں نو آبادیاتی نظام نظر آتا ہے۔ ناول میں تقسیم ہند سے پہلے کے حالات و واقعات سے لے کر ہندو مسلم فسادات، انگریزوں کی حکومت، تقسیم ہند کے حالت، تقسیم ہند کے وقت ہونے والی زیادتیوں اور تقسیم ہند کے بعد کے حالات کو قلم بند کیا گیا ہے۔

علی اکبر ناطق نے ناول میں ہندوستان کے لوگوں کی معصومیت اور سادگی کو بڑے عمدہ انداز میں پیش کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں ناول میں اس سادگی سے فائدہ اٹھانے والوں کی حقیقت بھی دکھائی گئی۔ کیوں کہ انگریز جانتے تھے کہ ان لوگوں میں اتنا شعور نہیں کہ وہ ہمارے خلاف آواز اٹھائیں اور آواز کیسے اٹھائی جاتی؟ جن لوگوں کو تعلیم دی جارہی تھی، انھیں ایسا کچھ نہیں سکھایا جاتا تھا کہ وہ اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کر سکیں۔ ہندوستانی باشندوں نے انگریز حکومت کو اپنا مقدر سمجھ لیا تھا اور اسی پر راضی تھے۔ انگریز حکومت کی غلامی کرنے میں انھیں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی بلکہ ہر وقت ان سے خوف زدہ رہتے تھے۔

> اس گاؤں میں غالباً پہلی دفعہ کسی گورے کی آمد ہوئی تھی اس لیے کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ حتیٰ کہ انھیں یہ تک پتہ نہیں تھا کہ فرنگی سے ڈرنے کا طریقہ کیا ہے۔ بس بڑبڑا کر

دیکھنے لگے۔[۵۱]

یہ ایک انگریز پولیس افسر کی بات کی جارہی ہے۔ کیوں کہ اس وقت فرنگیوں کی دہشت تھی۔ وہ پورے ملک میں کسی نہ کسی عہدے پر فائز تھے مگر افسروں میں فرنگی افسر اور ہندوستانی افسر میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ فرنگی افسر کے سامنے ہندوستانی افسر کی کوئی اوقات نہیں تھی۔ فرنگیوں کی دہشت اس قدر پھیل گئی تھی کہ ایک افسر سے پورا گاؤں ڈر کے مارے ہڑبڑا جاتا تھا اور ان پر خوف طاری ہو جاتا تھا۔ یہ دہشت خود بخود نہیں بنی تھی بلکہ انگریزوں نے اسے کئی تدبیروں سے ہندوستانی عوام پر طاری کیا تھا تاکہ ان کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھا سکے اور ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔

نوآبادیات کے نظام میں صرف حاکم کی غلامی نہیں کی جاتی بلکہ حاکم کی زبان، اس کی رسومات، تہذیب و ثقافت، اس کے مذہب کی بھی غلامی پر اکسایا جاتا ہے۔ کیوں کہ ان کا ماننا ہوتا ہے کہ وہ سب سے بدتر ہیں۔ اس لیے ان سے جڑی ہر چیز اعلیٰ درجے کی حامل ہے۔ اس لیے محکوم ریاست کو کم تر سمجھتے ہوئے ان کی زبان، رہن سہن اور ان کے مذہب کو بھی ناپسند کیا جاتا ہے اور انھیں اس بات کی تلقین کی جاتی ہے کہ وہ حاکم ریاست کا مذہب، ان کی زبان اپنائیں اور کسی حد تک وہ اس میں کامیابی بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی لوگ انگریزوں کی غلامی کے ساتھ ساتھ ان کی زبان کی بھی غلامی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ناول میں کئی جگہ انگریزی زبان کو اہمیت دیتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ انگریزی زبان کو "بادشاہوں" کی زبان کہا جاتا اور اسے سیکھ کر فخر محسوس کیا جاتا۔

> سرکار آخر انگریزی بادشاہوں کی زبان ہے اور سب زبانوں کی بادشاہ ہے۔ اس کو سیکھنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ میں اگر اس عمر میں لکھنے پڑھنے لگ گیا تو بچوں کو کیا کھلاؤں گا۔[۵۲]

ہندوستان میں جب تعلیم حاصل کرنا عام ہو گیا اس وقت بھی انگریزی کو اہمیت دی جاتی رہی۔ کیوں کہ ایک بڑا افسر بننے کے لیے ضروری تھا کہ اسے انگریزی اچھی طرح آتی ہو۔ نوآبادیاتی نظام میں نوآبادکار نوآبادیاتی باشندوں پر اپنی زبان مسلط کرتا ہے اور اپنی زبان کا رعب رکھتا ہے۔ زبانوں میں اس زبان کو افضل سمجھا جاتا ہے تو اس وقت انگریزی زبان میں باتیں کرنا ایک فخر سمجھا جاتا تھا۔

> کالج کے ماحول نے انگریزی کا اثر ڈالا تو مولانا فضل دین ایک ہی سال میں کئی باتیں انگریزی میں بولنے لگا۔ چھٹی پر جلال آباد آتا تو لوگ دیکھنے کے لیے آتے اور باتوں باتوں میں ایک دوسرے کو کہتے بھائی مولوی کا بیٹا تو کوئی بڑا انگریز بنتا جارہا ہے۔[۵۳]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ انگریزی زبان کو کس قدر اعلیٰ زبان سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کے چھٹی آنے پر اس کے گھر جا کر اس سے ملا جاتا اور دیکھا جاتا کہ کیسے یہ بالکل انگریزوں کی طرح باتیں کرنے لگ گیا ہے۔ کیوں کہ ان کے سامنے اس زبان کو اتنی اہمیت دی جاتی کہ وہ اسے بہت اعلیٰ درجے کی زبان سمجھنے لگے۔

نو آبادیاتی نظام میں نو آبادکار نو آبادیاتی باشندوں کو جاہل، کم عقل اور سست کہتے ہیں اور نو آبادیاتی باشندوں کو یہ دلائل دیے جاتے کہ ان کو بہتر بنانے کے لیے ان پر حکومت کی جا رہی ہے۔ کیوں کہ وہ ان سے بہتر قوم ہیں۔ اسی نقطۂ نظر کو لے کر نو آبادیاتی باشندے ان کے سامنے ہمیشہ احساسِ کمتری کا شکار رہتے اور وہ بھی انھیں شرمندہ کرنے اور ان کی جاہلیت پر بولنے میں کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ مثال ملاحظہ ہو:

> مالکم صاحب آپ مجھے بتائیے کہ اگر یہ قوم اتنی جاہل اور سادہ نہ ہوتی تو کیا ہم پندرہ بیس ہزار لوگ ان کروڑوں گدھوں پر حکومت کر سکتے تھے؟ ان کی یہی جہالت تو آپ کے لیے نعمت ثابت ہوئی۔ [۵۴]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز ہندوستانیوں کو کس قدر جاہل سمجھتے تھے اور اپنی اس حرکت پر فخر کرتے تھے کہ وہ ان پر حکومت کر رہے ہیں اور ہندوستانی عوام کو جانوروں سے منسوب کیا جاتا۔ ان کی اس جہالت کو اپنے لیے نعمت سمجھتے تھے کہ اگر وہ جاہل نہ ہوتے تو ہم اتنی کم تعداد میں اتنے زیادہ لوگوں پر کبھی بھی راج نہ کر سکتے تھے۔

چوں کہ انگریزوں کو معلوم تھا کہ یہ قوم پڑھی لکھی نہیں ہے اور یہاں وسائل لاتعداد ہیں مگر ان کا صحیح طریقے سے استعمال نہیں کیا جاتا۔ جس کی وجہ سے یہاں کے لوگ غربت کا شکار ہیں تو انگریزوں نے ان وسائل سے استفادہ کیا اور ہندوستانیوں کی سادگی سے فائدہ اٹھایا مگر فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ وہ ان کی اس سادگی پر طنز بھی کرتے اور اس کا بھرپور فائدہ بھی اٹھاتے۔

انگریزوں نے ہمیشہ خود میں اور ہندوستانیوں میں ایک فرق کو برقرار رکھا جسے ہم ناول میں دیکھ سکتے ہیں۔ ہندوستانیوں کو ہمیشہ اس فرق کا احساس دلایا جاتا کہ وہ انگریزوں کے غلام ہیں۔ اسی فرق کی بنا پر وہ ہندوستان پر راج کر رہے تھے۔ انگریزوں کے بڑے افسر اپنے ساتھیوں کو اس بات کی نصیحت وقتاً فوقتاً کرتے رہتے تھے کہ آپ نے اس فرق کو کہیں بھی ختم نہیں ہونے دینا۔ اگر یہ فرق مٹ گیا تو ہم ان پر حکومت نہیں کر سکیں گے۔

> تمھیں معلوم ہونا چاہیے، کالے اور سفید لوگوں کے درمیان ایک لکیر ہے۔ اسے جب بھی عبور کیا جائے گا، اسی وقت پر زمین اپنے گلے سے ہمارے اقتدار کی رسی کاٹ دے گی۔ میں بھی اس حق میں ہوں کہ کالوں کی غربت اور جہالت ختم ہونی چاہیے۔ اسے بہت حد تک ہم نے ختم کیا بھی

ہے لیکن کیا آپ اس بات کو بھول گئے کہ ہماری ان پر حکومت کا سبب ان کی یہی جہالت ہے۔ چناں چہ اسے ایک حد تک ان پر مسلط رکھنا ضروری ہے۔[۵۵]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں نے خود میں اور ہندوستانی عوام میں فرق کو کس قدر برقرار رکھا ہوا تھا۔ وہ اس بات سے واقف تھے کہ اگر انھوں نے اس فرق کو ختم کیا تو ہندوستان انھیں خود پر کبھی حکومت نہیں کرنے دے گا۔ اسی فرق سے انھوں نے ہندوستانیوں پر رعب اور خوف طاری کیا ہوا تھا۔ اسی لیے ہندوستانی بھی ان کے سامنے بولنے سے ہچکچاتے تھے اور ان پر فرنگی حکومت کی دہشت طاری رہتی تھی۔ اگر اس فرق کو ختم کرتے تو اس کا مطلب تھا کہ اپنے ہاتھوں سے اپنی حکومت ختم کر رہے ہیں۔ ان کے افسران بھی یہی نصیحت کرتے رہتے تاکہ اگر کسی کے ذہن سے یہ بات نکل جائے تو دوبارہ انھیں یاد کرائی جاتی کہ کبھی بھی اس فرق کو ختم نہیں ہونے دینا۔ جب تک ہم انھیں حقیر اور کم عقل کہتے رہیں گے، یہ احساس کمتری کا شکار رہیں گے اور ہم سے نہیں الجھیں گے۔ ہندوستانی باشندوں کو حقیر سمجھنے کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

وہ اس بات کی سختی سے قائل ہو گئی کہ کالے ایک بدبخت، نالائق اور منحوس قوم ہیں۔ ان کے جسموں سے بدبو آتی ہے۔ نہاتے نہیں اور گوروں کے درمیان بیماریوں کا سبب بنتے ہیں۔ ان کو پیار سے نہیں ذلت اور رسوائی کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔[۵۶]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی عوام کو بہت حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ انھیں بدبخت قوم سمجھ کر ان سے دور رہنا مناسب سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ انھیں بیماریوں کا سبب سمجھا جاتا تھا اور اس بات کے قائل تھے کہ ان لوگوں سے پیار سے نہیں پیش آنا چاہیے بلکہ جتنا ہو سکے انھیں ذلیل و رسوا کیا جائے۔

ناول میں ایک اور پہلو دکھایا گیا ہے کہ وہ اس وقت کے مسلمانوں کی حالت ہے۔ ایسی کیا وجہ تھی کہ تقسیم کے وقت تک ہندو ترقی کرتے جا رہے تھے اور مسلمانوں کی حالت بدتر تھی۔ اس کی وجہ تعلیم کی کمی تھی۔ مسلمان اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دیتے تھے، سکول نہیں بھیجا جاتا تھا۔ اس وجہ سے ان کے بچے بھی آگے نہ بڑھ پائے۔ ناول میں اس پہلو کو بھی پیش کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی پس ماندگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ "انگریزی سکولوں میں تو کرستان کا علم ہے۔ ان سکولوں میں جا کر ہمارے بچے کرستان ہو جائیں گے اور دین خراب ہو جائے گا۔ تم نے فرنگی سرکار سے پیسے کھا لیے ہیں۔"[۵۷]

مسلمانوں کا پیچھے رہ جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کیوں کہ انھیں لگتا تھا کہ ان کی نسل اپنے دین سے بھٹک جائے گی اور مسلمان مذہب سے عیسائیت کی طرف چلی جائے گی۔ کچھ حد تک ان کی یہ بات درست بھی تھی۔ انگریزوں نے عیسائی مشنریوں کو ہندوستان میں بلوایا ہوا تھا، وہ چاہتے تھے کہ یہ لوگ اگر عیسائی مذہب اختیار کر لیں

گے تو ہماری راہ میں رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ سکولوں میں بھی ایسی تعلیم دی جا رہی تھی مگر اس سب سے ہٹ کر مسلمانوں کے لیے تعلیم حاصل کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم دلوائیں تاکہ وہ ترقی حاصل کر سکیں۔ اس کے برعکس ہندو قوم نے تعلیم حاصل کی اور انگریزوں کی دی گئی تعلیمات پر عمل کر کے زندگی میں آگے بڑھنے لگ گئے۔ اسی لیے مسلمانوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ بھی پیچھے نہ رہیں اور تعلیم حاصل کریں۔

> او بھلے لوگو، تمھارے علاوہ یہ سب قومیں فٹافٹ ان سکولوں میں جا کر تعلیم حاصل کر رہی ہیں اور ہمارے بچے ایسے ہی ڈنگر کے ڈنگر بھیڑ بکریاں چرا رہے ہیں۔ کچھ تو خدا کا خوف کرو، کیا تم نے نہیں دیکھا، عدالتوں اور کچہریوں میں سب ہندو لوگ ہیں جو فیصلے بھی ہمارے خلاف کرتے ہیں اور یہ بنیے جو چاہیں اپنے بھئی کھاتوں میں لکھ دیں۔ پھر تمھاری گردن پر ناخن رکھ کر جتنا چاہیں وصول کر لیں۔ تمھیں تو نہ پڑھنا آئے اور نہ ان کھاتوں کے حساب کتاب کے دیکھنے کا طریقہ۔ اسی لیے ہمارے قرضے بڑھتے جاتے ہیں اور پشتوں سے لے کر اب تک ادا نہیں ہوتے۔ یاد رکھو اگر ہمارے بچے نہیں پڑھیں گے تو پنجاب پھر سکھوں کے پاس چلا جائے گا۔[۵۸]

مولوی کرامت علی کے ذمے ولیم نے یہ کام سونپا تھا کہ وہ اپنے مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ اپنے بچوں کو سکولوں میں داخل کروائیں۔ مولوی کرامت چوں کہ انگریزوں کی ملازمت کر رہا تھا اور ان کا دل سے مشکور تھا اس لیے اس نے ٹھان لی کہ وہ یہ کام اچھے طریقے سے کرے گا۔ اسی لیے وہ مسلمانوں کو اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر مولوی کرامت انھیں جو کچھ کہہ رہا تھا وہ بالکل صحیح کہہ رہا تھا۔ اسی میں مسلمانوں کی بھلائی تھی کیوں کہ ہندوؤں نے تو اپنے لیے ترقی کے راستے نکال لیے تھے۔ مشکلات زیادہ مسلمانوں کے لیے تھیں اس لیے لازم تھا کہ وہ تعلیم کی طرف توجہ دیتے اور آگے بڑھتے۔

ناول میں صرف مسلم معاشرہ گردش کرتا ہوا نہیں دکھایا گیا بلکہ اس کے ساتھ ہمیں ہندو، سکھ معاشرے کی تصویر بھی دکھائی دیتی ہے۔ طنز و مزاح، تشبیہات، کردار نگاری کے ملاپ سے علی اکبر ناطق نے ناول میں ایک نئی روح بخشی ہے۔ انھوں نے ہندوستانی سماج کے مختلف طبقوں کا نقشہ کھینچا۔ مشرق اور مغرب کی تہذیب کو بڑے عمدہ اسلوب کے ساتھ بیان کیا گیا۔

چوں کہ ناول میں دیہی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے تو اس میں ہندوستان کے دیہات کی زندگی کو بہت موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ علی اکبر ناطق خود بھی پنجاب (اوکاڑہ) سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے پنجاب کی

ذہنی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ پنجابی دیہی طریقہ دکھانے کے ساتھ ساتھ ناول میں پنجابی الفاظ کا استعمال ناول کی خوب صورتی کو بڑھا دیتا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

او بنیے جلدی ناول بھوجن دے دے، ہن بُھکھ بڑی لگ گئی آ۔

جدوں دیکھ گرنتھ پڑھ دی رہندی آپتا نہیں گروجی نال کوئی مک مکا کر لیا وا[۵۹]

ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

بنتو چھتی نال روٹی دے دے، سفر لمبا ہے اور دھپ دا کڑا ہا تپ جاندا۔[۶۰]

پنجابی ماحول کے مطابق ناول میں پنجابی زبان استعمال کی گئی۔ ناول میں کرداروں کے مطابق زبان کا استعمال کیا گیا جیسا کہ اگر سکھ ہے تو وہ ٹھوس پنجابی بولے گا۔

تحریر میں بڑے بڑے جملے اور مکالمے خوب صورتی کو ماند کرتے ہیں اور قاری ان سے اکتاہٹ محسوس کرنے لگتا ہے۔ ناول "نولکھی کوٹھی" میں گو کہ بڑے پیراگراف ہیں مگر اتنے بڑے نہیں کہ اس سے قاری اکتا جائے۔ ناول میں مکالمے چھوٹے اور رواں ہیں۔ مثال ملاحظہ ہو:

اس سے یہ ہو گا کہ حکومت مجرموں کو پکڑنے کی پابند ہو گی۔

پھر ان ملزموں کو گرفتار کر لیا جائے گا؟

میرا تو یہی خیال ہے:

اچھا اب یہ بتا کر ملزم گرفتار ہونے کے بعد اپنی ضمانت کی کوشش کریں گے یا آرام سے اپنے آپ کو جیل میں سڑنے دیں گے؟

وہ اپنی ضمانت کروانے کی کوشش کریں گے

اگر ضمانت ہو گئی تو پھر؟

پھر مقدمہ چلے گا۔[۶۱]

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناول میں جو مکالمے ہیں وہ بہت لمبے نہیں ہیں کہ قاری اس سے اکتاہٹ کا شکار ہو جائے اور ناول کی دل چسپی کم ہو جائے۔

جنگِ عظیم دوم کے بعد ہندوستان میں جو تحریکیں جنم لینے لگیں۔ ناول میں اس کا بھی نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جنگِ عظیم دوم کے بعد انگریزوں کا ہندوستان میں رہنا مشکل ہو گیا۔ انگریز جو خواب دیکھ رہے تھے کہ وہ مزید ہندوستان پر حکومت کریں گے مگر ان کا یہ خواب پورا نہ ہو سکا۔ ہندوستانیوں نے جب آزادی کے نعرے لگانے شروع کیے تو انگریزوں کو یہ باتیں ناگوار گزریں مگر اب ان کا کھیل ختم ہو چکا تھا۔ انھوں نے ہندوستان پر جتنی حکومت کرنی تھی وہ کر چکے تھے۔ اب ہندوستانی عوام میں شعور آ چکا تھا اور وہ مزید کسی کو اپنا حاکم ماننے والے نہیں

تھے۔ اس لیے انگریزوں نے بہتر یہی سمجھا کہ وہ اپنے وطن واپس چلے جائیں مگر کہانی کا مرکزی کردار ولیم اس بات کو سوچ کر غصے میں آ جاتا تھا کہ جنھیں ہم نے ترقی دی، ہم نے جن کی جہالت ختم کی، آج وہ ہمارے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں۔

> کبھی ہندوستانیوں کی بے وفائی اور احسان فراموشی پر غصہ آتا، جنھیں تعلیم دینے سے لے کر اور عقل سکھا کر جدید دور میں داخل کرنے تک صرف انگریز ہی کا کردار تھا۔ ورنہ یہ گنوار کے گنوار ہی رہتے۔ کل تک اجڈ اور جاہل آج بم دھماکے کر رہے تھے۔ جلسے جلوس نکال کر ایجی ٹیشن پھیلا رہے تھے اور انڈیا چھوڑ دو کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ [۶۲]

اس اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انھیں اپنے زوال کا بہت صدمہ پہنچتا تھا مگر انھوں نے ان کئی سالوں میں ہندوستان کو بہت لوٹا تھا، پر انھیں پھر بھی افسوس تھا کہ جن لوگوں کو ہم نے بولنا سکھایا، جب وہ سیکھ گئے تو ہمارے خلاف بدلنے نکل پڑے اور ہمیں یہاں سے نکالنے کے نعرے لگا رہے ہیں۔

انگریز ہندوستان چھوڑ کر واپس چلے گئے مگر ولیم کو ہندوستان سے اس قدر لگاؤ تھا کہ اس نے کسی بھی قیمت پر واپس جانا مناسب نہ سمجھا۔ ولیم کو ہندوستان سے اور "نولکھی کوٹھی" سے بہت لگاؤ تھا مگر وہ ہندوستانی عوام کو ناپسند کرتا تھا۔ خاص طور پر سرکاری افسران سے وہ نفرت کرتا تھا کیوں کہ اسے ایسا لگتا تھا کہ ہمارے زوال کا یہی سبب ہے اور یہ ہماری کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

> مجھے تم سے ہمدردی ہے لیکن پاکستانی افسروں سے میری مراد کلرک ہے۔ اس خطے کے لوگ آئندہ تین سو سال تک افسر نہیں بن سکیں گے۔ [۶۳]

انگریز حکومت ختم ہو گئی، ہندوستانیوں کی حکومت آ گئی اور ہندوستان میں رہتے ہوئے اس کی حکومت کو اتنی حقارت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا۔ ابھی تک اس کے دل میں ہندوستانی افسران کے لیے کوئی احترام اور کوئی ڈر نہیں تھا کہ میں یہاں اکیلا ہوں اور انہی کی حکومت ہے۔ وہ اپنی اکڑ میں رہا اور جیسے پہلے ہندوستانیوں کو حقیر سمجھا جاتا تھا، اب ان کے لیے اپنا نقطۂ نظر وہی رکھا گیا۔

ناول کا اسلوب شروع سے آخر تک نو آبادیاتی نظام کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں انگریزوں کے برصغیر میں عروج اور پھر زوال کی مکمل کہانی موجود ہے۔ انگریزوں کی نظر میں ہندوستان ایک سونے کے انڈے دینے والی مرغی کی طرح تھا۔ اسامہ صدیق "نولکھی کوٹھی" کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> "نولکھی کوٹھی" ایک عظیم بیانیے کو دریافت کرتا ہوا ناول ہے۔ ناطق نے اپنے اس ناول میں ہندوستان یں گردش کرتے ہوئے عموی نظریے کو رد کیا ہے۔ کہانی بہت دل چسپ اور

> کردار حقیقت کے اتنے قریب ہیں کہ قاری انھی میں جنم لے لیتا ہے۔ یہ ناول اردو ادب کے لیے ایک حقیقی نعمت ثابت ہوا ہے کہ اردو کا دامن اس ناول کے سبب زرخیز ہو گیا ہے۔ [۳۴]

مجموعی طور پر ناول میں اسلوب کو دیکھا جائے تو اس کی زبان شستہ اور سادہ ہے۔ قاری کو پڑھتے ہوئے پریشانی کا سامنا نہیں ہوتا بلکہ وہ اسے لطف اندوز ہو کر پڑھتا ہے۔ ہندوستان میں نو آبادیاتی نظام کو موثر انداز میں قلم بند کیا گیا ہے۔ گاؤں کے مناظر کو بڑے عمدہ طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ قاری خود کو اس ماحول میں تصور کرنے لگتا ہے۔ حقیقت نگاری کو مد نظر رکھتے ہوئے ناول نگار نے پنجاب کی آبادی، طبقاتی تقسیم اور انگریزوں کی چالوں کو ایک نمونے کے طور پر پیش کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ابراہیم سعد، *Little Oxford English Urdu Dictionary* (آکسفورڈ یونی ورسٹی، پریس، ۲۰۱۳ء)، ص ۶۰۲۔

۲۔ فیروز الدین، فیروز اللغات۔ اردو جامع (لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، سن ندارد)، ص ۹۴۔

۳۔ محمد عبد اللہ خان خویشگی، فرہنگِ عامرہ (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، طبع اول، جون ۱۹۸۹ء)، ص ۱۸۸۔

۴۔ ایف۔ سٹینگراس (F. Steingrass)، *A Comprehensive Persian-English Dictionary* (اورینٹل بک ریپرنٹ کارپوریشن، پہلا انڈین ایڈیشن، ۱۹۷۲ء)، ص ۱۲۸۔

۵۔ ایف۔ سٹینگراس (F. Steingrass)، *A Dearner's Arabic-English Dictionary* (ایشیئن پبلشرز، ۱۹۷۸ء)، ص ۱۳۰۔

۶۔ جمیل جالبی، قومی انگلش اردو ڈکشنری (۱۹۸۲ء)، ص ۱۰۴۶۔

۷۔ اے۔ای۔ڈار بے شرائن (A.E. Darby Shrine)، *A Grammar of Style* (لندن: اینڈرے ڈیوسائی، ۱۹۷۱ء)، ص ۷۔

۸۔ اعجاز راہی، اردو افسانے میں اسلوب کا آہنگ (راول پنڈی: ریز پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص ۱۲۔۱۳۔

۹۔ ایضاً، ص ۱۴۔۱۵۔

۱۰۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء)، ص ۱۳۔

۱۱۔ شمس الرحمان فاروقی، افسانے کی حمایت میں (بھارت: مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ، ۱۹۸۲ء)، ص ۱۱۸۔۱۱۹۔

۱۲۔ سید عابد علی عابد، اسلوب (لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع دوم، ۱۹۹۶ء)، ص ۳۶۔

۱۳۔ خلیل احمد بیگ، اطلاقی لسانیات (علی گڑھ: مسلم یونی ورسٹی، ۲۰۰۳ء)، ص ۱۴۔

۱۴۔ اشفاق حسین بخاری،اسلوبیاتی مباحث (اسلام آباد: شاخِ زریں،۲۰۱۶ء)،ص۵۶۔

۱۵۔ سید عبداللہ،اشاراتِ تنقید (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۰ء)،ص۲۵۶۔

۱۶۔ گوپی چند نارنگ،ادبی تنقید اور اسلوبیات (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۱ء)،ص۱۸۔

۱۷۔ خلیل احمد بیگ،تنقید اور اسلوبیاتی تنقید (علی گڑھ: مسلم یونی ورسٹی،۲۰۰۵ء)،ص۴۵۔

۱۸۔ گوپی چند نارنگ،" اردو ہماری اردو"،مشمولہ اردو زبان اور لسانیات،ص۴۹۔

۱۹۔ مرزا خلیل بیگ،زبان اور اسلوبیات (علی گڑھ: مکتبہ جامع لمیٹڈ یونی ورسٹی مارکیٹ، ۱۹۸۳ء)، ص۱۶۲۔

۲۰۔ عابد علی عابد، اسلوب،ص۹۹۔

۲۱۔ ایضاً،ص۱۰۳۔

۲۲۔ گوپی چند نارنگ،ادبی تنقید اور اسلوبیات،ص۳۹۰۔

۲۳۔ عابد علی عابد،اسلوب، ص۱۰۴۔

۲۴۔ ایضاً،ص۱۲۸۔

۲۵۔ ایضاً،ص۱۷۹۔

۲۶۔ ایضاً،ص۱۹۳۔

۲۷۔ ایضاً،ص۱۸۱۔

۲۸۔ گوپی چند نارنگ،ادبی تنقید اور اسلوبیات،ص۳۸۴۔

۲۹۔ ایضاً،ص۳۸۹۔

۳۰۔ ایضاً،ص۳۹۷۔

۳۱۔ ایضاً،ص۳۹۷۔

۳۲۔ ایضاً،ص۳۹۲۔

۳۳۔ علی اکبر ناطق،نولکھی کوٹھی (جہلم بک کارنر،۲۰۱۴ء)،ص۹۔

۳۴۔ ایضاً،ص۵۸۔

۳۵۔ ایضاً،ص۴۳۔

۳۶۔ ایضاً،ص۳۴۔

۳۷۔ ایضاً،ص۱۰۴۔

۳۸۔ ایضاً، ص۱۴۰۔

۳۹۔ ایضاً، ص۲۸۔

۴۰۔ ایضاً، ص۳۵۔

۴۱۔ ایضاً، ص۲۵۰۔۲۵۱۔

۴۲۔ ایضاً، ص۳۱۔

۴۳۔ ایضاً، ص۳۳۔

۴۴۔ ایضاً، ص۱۴۷۔

۴۵۔ ایضاً، ص۱۶۹۔

۴۶۔ ایضاً، ص۲۱۳۔

۴۷۔ ایضاً، ص۲۴۳۔

۴۸۔ ایضاً، ص۱۸۶۔

۴۹۔ ایضاً، ص۳۸۸۔

۵۰۔ ایضاً، ص۳۶۹۔

۵۱۔ ایضاً، ص۷۹۔

۵۲۔ ایضاً، ص۱۴۴۔

۵۳۔ ایضاً، ص۳۲۱۔۳۲۲۔

۵۴۔ ایضاً، ص۲۲۸۔

۵۵۔ ایضاً، ص۲۵۷۔۲۵۸۔

۵۶۔ ایضاً، ص۳۲۳۔

۵۷۔ ایضاً، ص۲۶۴۔

۵۸۔ ایضاً، ص۲۶۶۔

۵۹۔ ایضاً، ص۱۳۱۔

۶۰۔ ایضاً، ص۲۸۹۔

۶۱۔ ایضاً، ص۲۰۲۔

۶۲۔ ایضاً، ص۳۶۶۔

۶۳۔ ایضاً، ص۴۴۱۔

۶۴۔ ایضاً، ص۴۴۱۔

باب چہارم:

نولکھی کوٹھی میں نوآبادیات کے خلاف مزاحمتی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ

باب چہارم:

"نولکھی کوٹھی" میں نو آبادیات کے خلاف مزاحمتی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ

دنیا کی تخلیق سے نیکی اور بدی کا تصور چلا آرہا ہے۔ اکثر اوقات نیکی بدی پر حاوی ہو جاتی ہے تو کبھی بدی نیکی پر حاوی ہو جاتی ہے مگر جب بدی یا برائی حاوی ہوتی ہے تو اس کو روکنے کے لیے کوئی نہ کوئی رد عمل سامنے آتا ہے کیوں کہ ظلم کو ایک حد تک برداشت کیا جاتا ہے۔ جب یہ حد سے زیادہ بڑھ جائے تو اس کے خلاف آواز اٹھائی جاتی ہے جس سے مزاحمت جنم لیتی ہے اور اس کا مقصد معاشرے کی برائیوں، ناہمواریوں، استحصال اور عدم مساوات کو ختم کر کے لوگوں کو خوش حالی کی طرف لانا ہے۔

لفظ "مزاحمت" عربی زبان کے لفظ "زحم" سے مشتق ہے جس کے معنی حریف، ٹکرانے یا مدافعت کے ہیں۔[1] اگرچہ لفظ مزاحمت عربی سے مشتق ہے مگر عربی میں مزاحمت کے لیے "مقاومہ" یا معارضہ" استعمال کیے جاتے ہیں۔ لفظ مزاحمت بلوچی میں جل ووداد، پنجابی میں رکاوٹ، پشتو میں بندیز اور سندھی میں مزاحمت کے روپ میں استعمال ہوتے ہیں۔

اردو کی لغات میں "مزاحمت" کو ان معنوں میں استعمال کیا گیا ہے:

فرہنگِ آصفیہ: روک ٹوک، تعرض، اٹکاؤ اور ممانعت ہے[2]

فرہنگِ عامرہ: کسی پر تنگی کرنے والا[3]

علمی اردو لغت: روک، تعرض، ممانعت[4]

فرہنگِ تلفظ: رکاوٹ اور مخالفت[5]

فیروز اللغات: روک، تعرض اور ممانعت[6]

انگریزی میں اس کے لیے لفظ "Resistance" استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد مزاحمت وہ عمل ہے جو کسی بھی حرکت اختلاف کرنا، رکاوٹ کرنا ہیں۔ انگریزی لغت Collions Cobuild میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

تبدیلی کسی چیز کو قبول کرنے سے انکار کرنے کا عمل اور اس کو وقوع پذیر ہونے سے روکنے کی کوشش کے عمل کو مزاحمت کہا جاتا ہے۔[۷]

کیمبرج ڈکشنری میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

The act of fighting against something that is attacking you, or refusing to accept something.[۸]

اے۔ایس۔ہانبی (A.S.Hornby) اور اس کے ساتھی مصنفین کے مطابق:

مزاحمت کے معانی کسی کی مخالفت میں طاقت استعمال کرنا، رکاوٹ پیدا کرنے یا روکنے کے لیے اثر انداز ہونا یا مجبور کرنا، مخالفت کرنے کی خواہش کرنا اور مدافعت کرنا مراد ہوتے ہیں۔[۹]

مزاحمت ایک ایسا عمل ہے جس میں کسی کام میں رکاوٹ ڈالنا، معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھانا اور ظلم کے خلاف ڈٹ جانا ہے۔ضروری نہیں کہ مزاحمت مثبت ہو، مزاحمت مثبت اور منفی دو طرح سے کی جاتی ہے۔کوئی بھی انسان جہاں اپنی زندگی بسر کر رہا ہے، اس کے آس پاس جو کام اس کے خلاف ہو رہا ہے تو وہ اس پر مزاحمت کا اظہار کرتا ہے۔اس کے خلاف کوئی نہ کوئی اقدامات کرتا ہے۔ڈاکٹر طارق کلیم کے مطابق:

جبر کی تین صورتیں ہیں۔اول جب کوئی بیرونی قوت حملہ آور ہو جائے۔دوسری صورت ریاستی جبر ہے اور تیسری صورت جب معاشرے کا سیاسی و سماجی نظام خطرے کی زد میں آجاتا ہے۔[۱۰]

جب ایسی صورت حال جنم لے لے تو معاشرہ مزاحمتی رویہ اختیار کر لیتا ہے۔اردو میں مزاحمت کے متبادل الفاظ مدافعت، ممانعت، رکاوٹ، احتجاج اور بغاوت وغیرہ شامل ہیں۔احتجاج کسی بھی حاکم یا حکومت کے خلاف کیا جاتا ہے۔احتجاج مختلف طریقوں سے کیا جاتا ہے جن میں کسی ناپسندیدگی کے خلاف تقریر یا تحریر کے ذریعے ناراضگی کا اظہار کرنا ہے۔احتجاج انفرادی اور اجتماعی دونوں طریقوں سے کیا جا سکتا ہے۔اجتماعی طور پر احتجاج کرنے سے مراد ہے کہ لوگوں کا گروہ اکٹھا ہو کر جس چیز کے خلاف احتجاج کرنا ہے، اس کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور اپنے حق کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔

احتجاج کی اگر مثال پیش کی جائے تو موجودہ دور میں پاکستان کے سیاسی حالات کا جائزہ لیں تو اس سے بھی اس کی وضاحت ہو جاتی ہے جیسا کہ آج کل سیاسی مخالف جماعتیں حکومت پاکستان کے خلاف آوازیں بلند کر رہی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ موجودہ حاکم اس ملک کو نقصان پہنچا رہا ہے جس کی وجہ سے وہ احتجاج کرتی ہیں اور گروہ کی شکل میں احتجاجی تقاریر کے ذریعے اپنی آواز بلند کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔احتجاج کرتے وقت معاشرے میں رہنے والے شہری

بری طرح سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔ جہاں کہیں احتجاج کیا جارہا ہوتا ہے وہاں نظام زندگی درہم برہم ہو جاتا ہے اور شہریوں کو کئی طرح سے نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

جب مسائل کا حل احتجاج کے ذریعے نہیں نکلتا تو وہاں پر بغاوت جنم لیتی ہے۔ اس کے لغوی معنی غداری کے ہیں۔ کسی نظام کے خلاف یا کسی بھی مہم کے خلاف ٹکراؤ کو بغاوت کا نام دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر حکومت کے احکامات کی نافرمانی کرنا اور ملک میں لاگو کیے گئے قوانین کی اطاعت نہ کرنا بھی بغاوت کے زمرے میں آتا ہے۔ جن ممالک میں حکومت عوام کا خیال نہ رکھے اور ان کا استحصال کرے وہاں ڈھکی چھپی یا ظاہری طور پر کسی نہ کسی صورت میں بغاوتیں جنم لیتی ہیں۔ اس کا اظہار سب سے پہلے قدیم یونانی ادب میں نظر آتا ہے، جس کی مثال فلسفی سقراط کی ہے جس نے حق کی بات کی تو اس کے بدلے اسے زہر کا پیالہ پلا دیا گیا اور اس نے وہ زہر پی لیا مگر حق بات کرنے سے گریز نہیں کیا۔ اس طرح آنے والی نسلوں کو یہ پیغام دے دیا کہ حق کی بات کریں چاہیں اس کے لیے اپنی جان کی بازی کیوں نہ ہارنی پڑ جائے۔ یوں اس نے مزاحمت کی مثال پیش کر دی۔

انقلاب کسی سماجی ناہمواری کے خلاف لوگوں کا باقاعدہ تحریک کے ذریعے مقاصد کا حصول ہے یعنی انقلاب کسی بھی کام کو نئے سانچے میں ڈھالنے کا نام ہے۔[۱۱] انقلاب کے لغوی معنی تغیر و تبدل، گردش، زمانے کا چکر کھانا، پرانے سیاسی یا معاشی نظام کی جگہ نئے نظام کا نفاذ کے ہیں۔[۱۲] انقلاب کسی بھی ملک کے قوانین کو نئے سرے سے بنانے کے لیے اس ملک کے باشندوں کے ذریعے وجود میں آتا ہے۔ کسی بھی ملک کا حاکم جب اس ملک کی عوام کا استحصال کرتا ہے تو عوام اس استحصالی دور کو ختم کرنے کے لیے انقلاب لاتی ہے۔ انقلاب اور بغاوت ہم معنی الفاظ ہیں۔ دونوں صورتوں میں ظلم کے خلاف آواز اٹھائی جاتی ہے اور اس کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر وہ اس تحریک میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو انقلاب کہلایا جاتا ہے اور اگر اس میں ناکام ہو جائیں تو اسے بغاوت کا نام دیا جاتا ہے۔ انقلاب کی کئی صورتیں ہیں جن میں سیاسی، معاشی، صنعتی اور اقتصادی انقلاب وغیرہ شامل ہیں۔

ادب میں احتجاج، بغاوت اور انقلاب کو مزاحمت کے متبادل الفاظ کی حیثیت حاصل ہے۔ علی جاوید اپنی کتاب میں ان اصطلاحوں کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ ”انقلاب، بغاوت اور احتجاج ایک دوسرے کے قریب ضرور ہیں لیکن ان میں بہت فرق ہے۔۔۔۔۔ انقلاب کے معنی کسی سماج کی معاشیات کے پیداواری رشتے میں مکمل تبدیلی یا دوسرے الفاظ میں کسی سماجی ڈھانچے میں مکمل سماجی، سیاسی اور معاشی تبدیلی کے ہیں۔ انقلاب کے لیے عمل پیہم ضروری ہے اور انقلاب کا تعلق کسی باقاعدہ تحریک سے ہوتا ہے جس کے مقاصد پہلے سے طے ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی انلقاب کے لیے انقلابی شعور کا ہونا لازمی ہے جب کہ احتجاج کسی بھی سماجی نظام یا تحریک سے ناراضگی کا ردعمل ہو سکتا ہے۔۔۔۔ اسکے علاوہ احتجاج کسی بھی شے کے خلاف اسے ختم کرنے کا راستہ ہموار نہیں کرتا۔۔۔۔ جس طرح

انقلاب اور احتجاج میں فرق ہے ویسے ہی بغاوت اور احتجاج بھی معنوی سطح پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کسی نظام کے خلاف ٹکراؤ یا کسی بھی رسم ورواج کے خلاف مہم کو بھی بغاوت کا نام دیا جاسکتا ہے۔۔۔۔ جب کہ احتجاج کسی شے سے لا تعلقی یا ناراضگی کا اظہار ہے جو مقابلہ کی حد تک نہیں پہنچتا اور نہ ہی کسی ناپسندیدہ شے سے نجات پانے کا راستہ ہموار کرتا ہے۔''[۱۳]

علی رفاد فتیحی اپنے مضمون "مزاحمت کی شعریات" میں واضح کرتے ہیں کہ:

> مزاحمت ایک مضبوط اختلاف کا اظہار ہے ۔ اسی طرح مزاحمت بنیادی طور پر ایک انقلابی سرگرمی ہے۔ اس کے برعکس احتجاج کی اصطلاح میں ایک سے زائد تجربے اور اس کی توانائی کا پہلو شامل ہوتا ہے۔ گویا احتجاج اور مزاحمت کے درمیان فرق یہ ہے کہ احتجاج روایتی طور پر منصوبہ بندی، منظم، منضبط، شعوری اور اجتماعی ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ دوسری جانب مزاحمت غیر منصوبہ بندی، غیر منظم، غیر شعوری انفرادی عمل ہے۔[۱۴]

چوں کہ مزاحمت ایک قدرتی عمل ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مزاحمت ایک ایسا رویہ ہے جو کہ ازل سے انسان کی فطرت میں شامل ہے اور کائنات میں ہر طرف نظر آتی ہے۔ یہ وہ سوچ اور احساس ہے جو ظلم، جبر، استحصال، ناانصافی، معاشی برائیوں کے خلاف انسان کو آواز اٹھانے پر اکساتی ہے۔ روبینہ سہگل مزاحمت کی وضاحت کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

> مزاحمت ہر ایسے عمل، سوچ، رویے یا طریق کار کو کہا جا سکتا ہے جو کسی ناانصافی، ظلم، تشدد و بربریت یا جبر کے خلاف کیا گیا ہو۔ مزاحمت سے مراد ہے کسی چیز کو روکنا، کسی ظلم کی مخالفت، کسی ناانصافی کو برداشت کرنے سے انکار کرنا اور عملی و متحرک انداز میں کسی ظلم کا سدباب کرنا۔[۱۵]

انسان کو جذبۂ آزادی اور عزتِ نفس کے احساس کے ساتھ تخلیق کیا گیا ہے اور کہیں نہ کہیں ہم ازل سے دیکھتے آئے ہیں کہ انسان نے اپنی شخصی آزادی، اپنی عزتِ نفس اور اپنی بقاء کے لیے جدوجہد کرتا رہا ہے۔ جہاں اسے یہ محسوس ہوتا کہ اس ظلم کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے وہاں اس نے آواز بلند کر کے مزاحمت شروع کر دی۔ مزاحمت لاتعداد پہلوؤں پر محیط ہے۔ عملی طور پر اس کی دو صورتیں ہیں۔ نوعیت کے اعتبار سے اس کی درج ذیل اقسام ہیں۔

۱۔ انفرادی مزاحمت

۲۔ اجتماعی مزاحمت

انفرادی مزاحمت:

انفرادی مزاحمت کا تعلق ایک فرد سے ہوتا ہے۔ سماج میں کوئی بھی شخص جو ظلم وستم، استحصال اور محرومی کا شکار ہو تو وہ خود کے تحفظ کے لیے مزاحمتی رویہ اختیار کرتا ہے۔ بعض اوقات انسان کو اپنے اردگرد کے ماحول سے خطرہ ہوتا ہے۔ وہ خود کو محفوظ نہیں سمجھتا تو اپنی حفاظت کے لیے وہ مزاحمت کرنے لگتا ہے۔ اس کی مثال ایک ایسے ظالم آقا کی ہے جو اپنے غلام پر ظلم وستم کرتا ہے اور اسے اس کا حق نہیں دیتا، غلام ایک حد تک برداشت کرتا ہے مگر اس کے بعد وہ اپنے آقا کے خلاف ہو جاتا ہے اور بغاوت پر اتر آتا ہے اور پھر اپنے حق کے لیے مزاحمت کی راہ اختیار کرتا ہے۔ روبینہ سہگل نے اپنی کتاب میں غلاموں کی بغاوت کی مثال اس طرح سے دی ہے کہ:

> قدیم زمانے سے غلاموں کی آزادی کی بغاوتیں مشہور ہیں۔ زنجیروں میں جکڑے ہوئے غلاموں نے مل کر غلامی کے خاتمے کے لیے بغاوت کی۔۔ کیوں کہ غلاموں کو انسان تصور نہیں کیا جاتا تھا اور ان پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے جاتے تھے۔ ان بغاوتوں میں سب سے مشہور بغاوت ۷۱ تا ۷۳ قبل مسیح میں ہونے والی سپارٹکس کی ناکام بغاوت ہے جس میں رومیوں نے غلاموں کو تختہ دار پر لٹکا دیا۔[۱۶]

انسان فطری طور پر مزاحمتی رویہ لے کر اس دنیا میں آتا ہے۔ اس لیے وہ سماج میں کسی نہ کسی نظام کے خلاف ہونے پر مزاحمتی رویہ اختیار کر لیتا ہے۔ چوں کہ ہر انسان میں مقابلہ کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے اس لیے وہ اپنی اس صلاحیت کو استعمال میں لاتا ہے اور اپنے حق کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ قدیم زمانے میں وسائل کی کمی ہونے کے باعث انسان ہی انسان کا دشمن ہو جاتا تھا، صرف وسائل حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے تھے تو جب ایسے فرد کو معاشرہ روکتا ہے تو اس کے خلاف ردعمل کا اظہار ہوتا ہے جو کہ انفرادی مزاحمت ہے۔

اجتماعی مزاحمت:

معاشرے کا ایک طبقہ جب مجموعی طور پر ظلم وستم، جبر، استحصال یا زیادتی کا شکار ہو تو اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے وہ مزاحمت کا راستہ اختیار کریں تو اسے اجتماعی مزاحمت کہا جائے گا۔ اس کے مقاصد واضح ہوتے ہیں۔

> اجتماعی مزاحمت بہت سے افراد جو کسی ظلم وستم کا اکٹھے شکار ہوں، مل کر کام کرتے ہیں۔ اجتماعی مزاحمت کے لیے ضروری ہے کہ بہت سے افراد کسی ظلم کی اجتماعی شکل کو پہچانیں، آپس میں یک جہتی محسوس کریں اور اس بات کو تسلیم کریں کہ یہ ظلم سب کے خلاف ہے۔[۱۷]

اجتماعی مزاحمت کی تاریخ میں بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ دنیا میں اس کی سب سے بڑی مثال نوآبادیاتی نظام کی

ہے۔ نو آبادیاتی نظام کے خلاف جو تحریکیں چلتی ہیں اور اپنے حق کے لیے لڑتی ہیں انھیں اجتماعی مزاحمت کہا جاتا ہے۔ جہاں قابضین پسماندہ ممالک پر قبضہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور ان کے وسائل لوٹتے ہیں، ان کا استحصال کرتے ہیں، ان پر ظلم کرتے ہیں تو کچھ عرصے کے بعد وہ مقامی باشندے اپنے حقوق کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اور مجموعی طور پر اکٹھے ہو کر تحریکیں چلاتے ہیں اور اس کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور اپنے ان مقاصد میں کامیاب ہونے کے لیے کئی قربانیاں دینے سے بھی رائیگاں نہیں جاتے۔ اجتماعی مزاحمت میں ایک واضح نصب العین ہوتا ہے اور نتیجے میں اگر ان کی یہ مزاحمت انھیں ان کے حقوق دلوا دیتی ہے تو یہ انقلاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اگر مزاحمت کرنے میں کامیابی حاصل ہو گی تو اسے انقلاب کہا جائے گا اور اگر مزاحمت میں کامیابی حاصل نہ ہوئی تو اسے ناکام مزاحمت کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال انقلاب فرانس ہے جو ۱۷۸۹ء میں رونما ہوا تھا۔

اٹھارویں صدی میں فرانس کے تمام معاشی وسماجی وسائل پر بادشاہوں کا قبضہ تھا۔ درباروں میں عیاشیاں ہو رہی تھیں تو دوسری طرف عوام بھوک سے مر رہی تھی۔ لوگوں کے پاس کھانے تک کو کچھ نہ تھا۔ غریب عوام افلاس اور غربت کا شکار تھی۔ کسان طبقہ ٹیکسوں کے بھنور سے ہی آزاد نہ ہو پاتا تھا جہاں واضح طور پر استحصال اور ظلم ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس ظلم کے خلاف جولائی ۱۷۸۹ء میں آواز اٹھائی گئی اور بیسیل جیل پر حملہ کر کے قیدیوں کو رہا کر کے انقلاب کا آغاز کر دیا گیا۔ انھیں معلوم تھا کہ ان کا دشمن کون ہے؟ اور ان کے مقاصد کیا ہیں؟ یہ اجتماعی مزاحمت کی بہت اعلیٰ مثال ہے جہاں معاشرے میں انفرادی مسائل حل کرنے کے لیے ایک تحریک کی صورت اختیار کر کے اپنے حقوق حاصل کرنا۔

اجتماعی مزاحمت کی مثالیں ہمیں اسلامی حوالے سے بھی دیکھنے کو ملتی ہیں جیسا کہ غزوات میں ایک واضح مقصد کو سامنے رکھ کر کفار اور یہود کی رکاوٹوں کو عبور کرنا۔ اس کے ساتھ ساتھ فتح مکہ اس کی سب سے بڑی مثال ہے جب مسلمان اپنے مقصد کے لیے شانہ بشانہ لڑے اور اپنا خواب پورا کیا۔

اجتماعی مزاحمت کی ایک اور بہت بڑی مثال ہمیں ہندوستان میں ملتی ہے جب انگریزوں کا راج تھا۔ اس کے بعد ہندوستانیوں نے اپنے لیے آواز اٹھائی۔ قائداعظم کی بے لوث قیادت میں مسلمانوں نے اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے الگ وطن کا مطالبہ کیا اور اس میں کامیابی حاصل کی۔ الگ وطن کو حاصل کرنے کے لیے انھیں بہت سی قربانیاں دینی پڑیں اور پھر ایک ایسا انقلاب رونما ہوا جو در الگ ریاستوں کی شکل میں وجود میں آیا۔ یہ سب اجتماعی مزاحمت کی مثالیں ہیں۔

عملی مزاحمت کی دو صورتیں:

عملی طور پر مزاحمت کی دو صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک صورت ایسی ہے جس میں معاشرے میں ظلم، جبر، معاشی استحصال کے خلاف کھڑے ہو کر جسمانی مزاحمت کرتے ہوئے اپنے حقوق کو حاصل کیا جاتا ہے اور اس میں ہتھیار تک اٹھالیے جاتے ہیں۔

عملی مزاحمت کی دوسری صورت پیچیدہ ہے۔ اس میں کبھی ہتھیار نہیں اٹھائے جاتے۔ اس میں معاشرے کا حساس طبقہ جیسا کہ ادیب چاہے وہ کسی بھی زبان میں ادب تخلیق کرتا ہو۔ وہ معاشرے میں ہونے والے ظلم و استحصال کو اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ اس وقت معاشرے میں جو حالات ہوتے ہیں انھیں دیکھ کر، انھیں محسوس کرکے، اسے اپنے لفظوں کی شکل میں ڈھال کر پیش کر دیتا ہے۔ اردو میں ادیبوں نے نو آبادیاتی نظام کے خلاف پہلے ڈھکے چھپے الفاظ میں مزاحمت کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ادیبوں نے مسلمانوں کے استحصال کے خلاف لفظی مزاحمت کی۔

ڈاکٹر آغا ظفر حسین نے اپنی کتاب مزاحمت اور پاکستانی اردو شاعری میں مزاحمت کی اقسام بیان کی ہیں۔ ان کے مندرجہ ذیل جواز ہیں:

۱۔ معاشی جبر

۲۔ سیاسی جبر

۳۔ ریاستی جبر

۴۔ مذہبی انتہا پسندی

۵۔ تاریخی جبر

۶۔ سماجی و تہذیبی جبر

۷۔ لسانی جبر

۸۔ نفسیاتی جبر

معاشی جبر کے خلاف مزاحمت:

حرص اور لالچ انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ زیادہ دولت اکٹھی کرنے کے چکر میں بعض اوقات لوگ انسانیت کو بھول جاتے ہیں۔ یوں کئی لوگ امیر ہوتے چلے جاتے ہیں ار جو لوگ غریب ہوتے ہیں، جن کا معیارِ زندگی پست ہوتا ہے وہ مزید غربت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ امرا اور عیش و عشرت میں زندگی بسر کرنے والے انسان کو انسان

ہی نہیں سمجھتے۔ نچلے طبقے کے حقوق کا استحصال کرتے رہتے ہیں اور اپنی تجوریاں بھرتے رہتے ہیں۔ اس طرح نچلے طبقے کو زندہ رہنے کے لیے دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں ہوتی۔ وہ اپنا تن ڈھانپنے اور پیٹ بھرنے کو ترس جاتے ہیں اور یوں معاشی ناہمواری اور معاشی جبر کے خلاف مزاحمت کا آغاز ہوتا ہے۔ اس ضمن میں تیسری دنیا کے ممالک سب سے پہلے آتے ہیں جہاں زیادہ تر استعماری طاقتیں قبضہ کر کے بیٹھی ہیں اور دفاعی طاقت کے لیے اور دنیا پر اپنا رعب بٹھانے کے لیے اپنا پیسہ پانی کی طرح بہارہی ہیں لیکن یہ سرمایہ غربت سے گھرے طبقے کے کام نہیں آتا۔

تاریخ میں معاشی جبر کے خلاف کی گئی مزاحمت پر ہمیں کئی مثالیں ملتی ہیں مگر بیسویں صدی میں نوآبادیات کے خلاف انقلاب فرانس اور روس کی مزاحمت سرفہرست ہیں۔ ڈاکٹر آغا ظفر ان دونوں مثالوں کا حوالہ ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ:

> معاشی جبر کے خلاف مزاحمت سے یوں تو تاریخ انسانی بھری پڑی ہے مگر۔۔۔۔ انقلاب روس اس اعتبار سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ خالص مادی نظریات پر مبنی معاشی استحصال اور اس سے نجات کی تھیوری کے تحت وسیع و عریض ریاست کی تشکیل عمل میں آئی۔ زندگی کے تئیں ترقی پسندانہ نقطۂ نظر رکھنے والے اور دبے کچلے عوام نے اس انقلاب سے متاثر ہو کر اپنے ملکوں میں آزادی اور معاشی عدم مساوات کی جو جدوجہد کی، اس بنا پر ایک زمانے میں آدھا گلوب سوشلسٹ نظام حکومت کے تحت آ گیا تھا۔ [۱۸]

معاشی جبر کے خلاف مزاحمت صرف فرانس اور روس کی مثالیں نہیں بلکہ موجودہ دور میں بھی اس کے خلاف مزاحمت جاری ہے۔ پھر چاہے وہ مزاحمت انفرادی ہو یا اجتماعی۔ انفرادی مزاحمت کی اگر بات کی جائے تو دورِ حاضر میں ہم ایسے طبقے کو دیکھتے ہیں جن کا معاشی استحصال ہو رہا ہے تو اس کے نتیجے میں وہ مختلف قسم کے جرائم کرنے لگتے ہیں۔ ان کی مزاحمت جرائم کی صورت میں ہوتی ہے۔ اگر اجتماعی مزاحمت کی بات کریں تو دنیا کے مختلف ممالک میں معاشی جبر کے خلاف ہمیں کئی تحریکیں اور احتجاج ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یکم مئی کو مزدوروں کا ہونے والا احتجاج بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔

سیاسی جبر کے خلاف مزاحمت:

سیاسی جبر درحقیقت سیاسی بدعنوانی ہے۔ سیاسی بدعنوانی سے مراد سیاست دانوں کا غیر مثبت رویہ ہے۔ سیاست دان عوامی خدمت کا نعرہ لگاتے ہوئے عوام سے ووٹ حاصل کر لیتے ہیں مگر جب وہ اقتدار میں آجاتے ہیں تو وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ انھوں نے عوام کے حقوق کی حفاظت کرنی ہے۔ وہ اس میں عدم دل چسپی ظاہر

کرتے ہیں کیوں کہ انھیں صرف اپنے اقتدار سے غرض ہوتی ہے۔ سیاست دانوں کے اس رویے کے متعلق ڈاکٹر آغا حسین رقم طراز ہیں کہ:

> سیاست دانوں کی عوامی مسائل سے دل چسپی، رشوت ستانی، عیش پرستی، ضمیر فروشی، اخلاقی پستی، سیاسی جماعتوں کی فرقہ پرستی، نسل پرستی اور ذات پات کی پالیسی، سیاست کا مجرمانہ، مجرموں کا سیاسیانہ، یہ وہ چند حقیقتیں ہیں جو اس عہد کی سیاست کا خاصہ بن چکی ہیں۔[۱۹]

اس سیاسی ناہمواری کی وجہ سے عوام بغاوت کرنے اور مزاحمت کرنے پر مجبور ہو گئی ہے۔ آج کا سیاست اس لیے منتخب نہیں ہوتا کہ وہ اقتدار میں آ کر عوامی مسائل کو حل کرے اور نچلے طبقے کا طرزِ حیات بہتر کرے بلکہ اسے صرف اور صرف اپنے اقتدار سے لگاؤ ہوتا ہے۔ وہ اسے اپنے ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ قومی دولت سے وہ عوام کو فائدہ پہنچانے کی بجائے اپنی تجوریاں بھرنے میں لگا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ نچلے طبقے کا جینا محال ہو گیا ہے۔ وہ غریب سے غریب تر ہوتے جا رہے ہیں مگر حکمران کو اس سے کوئی غرض نہیں۔ وہ اپنے اختیارات کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس کی مثال ہمارا اپنا ملک پاکستان ہے۔ پاکستان کے سیاست دانوں کو دیکھا جائے تو ووٹ لینے دیں گے، مظلوم کو اس کا حق دلوائیں گے، غربت کا خاتمہ کریں گے مگر جب یہی سیاست دن اقتدار میں آتے ہیں تو کیے گئے یہ سب وعدے بھول جاتے ہیں اور خود کو امیر سے امیر تک کرتے چلے جاتے ہیں۔ جب ایسی صورت حال ہوتی ہے تو وہاں مزاحمت اور بغاوت جنم لیتی ہے۔ عوام جب یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ حکمران نہ تو ہماری حفاظت کر رہا ہے اور نہ ہی ہمیں حقوق دے رہا ہے تو اس کے خلاف مزاحمت شروع ہو جاتی ہے۔ وہ اس ناانصافی کے خلاف احتجاج پر اتر آتے ہیں اور تخلیق کار اس کو اپنی قلم کے ذریعے بیان کرتا ہے جو وہ معاشرے میں دیکھتا ہے اسے محسوس کر کے الفاظ کی شکل میں بیان کر دیتا ہے۔

ریاسی جبر کے خلاف مزاحمت:

انسان کے کچھ حقوق ہیں جن میں ایک شخصی آزادی ہے۔ جب اس کی شخصی آزادی کی راہ میں ریاست رکاوٹ بنے تو اس کے خلاف کی گئی مزاحمت ریاستی جبر کے خلاف مزاحمت کہلاتی ہے۔ ریاستی جبر کے خلاف مزاحمت کی کئی صورتیں ہیں جن میں شہنشاہت کے خلاف اور فوجی آمریت کے خلاف مزاحمت شامل ہے۔

تاریخ میں بہت سی مثالیں ایسی ہیں جن میں شہنشاہت نے لوگوں کے شخصی حقوق کی پامالی کی جس کی وجہ سے شہنشاہت اور فوجی آمریت کو رد کرتے ہوئے جمہوریت کو منتخب کیا گیا۔

ریاستی جبر سے مراد نسلی، قومی یا لسانی شناخت سمیت دیگر وجوہ کی بنا پر عالمی قانون کے برخلاف، کسی گروہ یا جماعت کی شناخت کی وجہ سے اس کے انسانی حقوق کی دیدہ و دانستہ اور سنگین پامالی کا ارتکاب ہے۔[۲۰]

ریاستی جبر کے خلاف کئی صورتوں میں مزاحمت اختیار کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر آغا ظفر حسین نے ریاستی جبر کے خلاف مختلف رویوں کا اظہار یوں کیا ہے:

۱۔ ملک کے کسی مخصوص طبقے، کسی مذہبی، لسانی اور علاقائی گروہ کے جائز حقوق کی طرف سے ریاستی روگردانی۔

۲۔ انتخابی عمل میں مداخلت۔

۳۔ ذرائع ابلاغ پر قدغن یعنی ادیب و دانش ور کو آزادیٔ اظہار سے روکنا اور حکومتی موٴقف کی مبالغہ آمیز حد تک تشہیر۔

۴۔ ملک کے تعلیمی، ثقافتی اور دوسرے اہم اداروں میں حکومت سے اختلاف رکھنے والے لوگوں کی حوصلہ شکنی کرنا۔

۵۔ کسی بھی معاملے میں حکومت کے مخالفین کو بے جا ہراساں کرنا اور ان کو باغی قرار دینا۔

۶۔ اہم قومی اور بین الاقوامی مسائل پر اکثریت کو نظرانداز کر کے یک طرفہ فیصلے کرنا۔

۷۔ عوامی رجعت پسندی کو فروغ دینا۔

۸۔ احتجاجی مظاہروں پر پابندیاں لگانا۔[۲۱]

مذہبی انتہاپسندی کے خلاف مزاحمت:

دنیا میں تمام مذاہب امن، سکون اور اخلاق کا درس دیتے ہیں۔ ہر مذہب کے پیروکار اپنے مذہب کو دوسرے مذاہب کی نسبت افضل کہتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے مذہب کی تشریح کرتے ہیں تو انتہاپسندی جنم لیتی ہے۔ لوگ دوسرے مذاہب کو کم تر اور برا بھلا کہتے ہیں جس سے معاشرے میں فسادات جنم لیتے ہیں۔ ان کے خلاف کی جانے والی مزاحمت کو مذہبی انتہاپسندی کے خلاف مزاحمت کہا جاتا ہے۔

ہر مذہب میں چند رسومات ہوتی ہیں جیسا کہ مسلمانوں میں نماز، روزہ اور تلاوت وغیرہ شامل ہیں۔ ہندوؤں میں گنگا نہانا اور دیوی آرتی شامل ہے۔ عیسائی ہر اتوار کلیسا میں اجتماعی عبادت کرتے ہیں۔ ان سب کا مقصد عرفان الٰہی کا قرب حاصل کرنا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ دوسرے مذاہب اور عقائد کے خلاف ہو جاتے ہیں اور ان کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں۔ دورِ حاضر میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے بھارت میں ہندو انتہاپسندوں نے

کرناٹکہ میں تعلیمی اداروں میں مسلمان لڑکیوں کو حجاب کرنے سے روکا۔ ان کے لیے مشکلات پیدا کرنے لگے۔ مسلمان لڑکیاں برداشت کرتی رہیں بالآخر ان میں سے ایک لڑکی ہندوؤں کے "جے شری رام" کے نعرے کے جواب میں "اللہ اکبر" کے نعرے لگائے گی اور اپنے عقیدے پر ڈٹی رہی۔ یہ مذہبی انتہا پسندی کے خلاف مزاحمت کی اعلیٰ مثال ہے۔

تاریخی جبر کے خلاف مزاحمت:

عام انسان اور تخلیق کار جس عہدے سے بھی تعلق رکھتے ہوں۔ وہ اپنی گفتگو اور فن پاروں میں تاریخ میں ہونے والے جبر کو اپنے الفاظ کی شکل ضرور دیتے ہیں اور اس پر اظہار افسوس بھی کرتے ہیں۔ تاریخ کی بات کی جائے تو ہمیں ایسے بے شمار واقعات ملتے ہیں جن میں انسانی زندگی بہت بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ ہندوستان کی تقسیم سے قبل جنگِ آزادی، عالمی جنگیں، ہجرت کا کرب، پاک بھارت کی جنگیں، سقوط ڈھاکہ وغیرہ ایسے واقعات ہیں جس نے برصغیر کے تمام شہریوں کو متاثر کیا۔ ہمارے ادبا اور شعرا جب تاریخ پر اپنی قلم اٹھاتے ہیں تو ایسے واقعات کو بیان کرتے ہوئے مزاحمت کا اظہار کرتے ہیں۔

سماجی تہذیبی جبر کے خلاف مزاحمت:

ہر خطہ اپنی ایک تہذیب رکھتا ہے جسے وہ اپنی پہچان بھی بناتا ہے اور اس کی بنا پر ترقی کے منازل طے کرتا ہے مگر بعض اوقات ایسا ہوتا ہے جب طاقت ور قومیں اس خطے پر اپنا قبضہ جما لیتی ہیں تو وہ ان لوگوں کے حقوق چھیننے کے ساتھ ساتھ ان سے ان کی شناخت اور تہذیب بھی چھین لیتی ہیں۔ وہ نہیں چاہتیں کہ اس خطے کے لوگ اپنی تہذیب کو یاد بھی کریں۔ چوں کہ وہاں ان کا اقتدار ہوتا ہے اس لیے وہاں وہ اپنی تہذیب کو فوقیت دیتی ہیں اور اس خطے کے لوگوں کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ ان کی تہذیب کو اپنائیں۔ اس کی مثال برصغیر میں نوآبادیاتی دور کی ہے جب انگریزوں نے یہاں حکومت کی تو انہیں یہ بات بری محسوس ہوتی تھی کہ ہندوستانی عوام اپنی تہذیب کو ساتھ لے کر چلیں۔ انگریز ہندوستان کی تہذیب اور یہاں کے رسوم و رواج کو فرسودہ لیتے تھے اور اس بنا پر ہندوستانی عوام کو کم عقل اور جاہل جیسے القب دیے جاتے تھے۔

عہدِ حاضر میں بھی ہمیں مغربی تہذیب سے خطرہ لاحق ہے۔ کیوں کہ ہمارے ہاں مغربی تہذیب کو اہمیت دی جانے لگی ہے۔ ہمارے رہن سہن کے طریقے مغربی طرز اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ معاشرے میں باشعور طبقہ اس کے خلاف مزاحمت کرتا ہے اور ان لوگوں کو اپنی تہذیب اور روایات اپنانے کا درس دیتا ہے جو مغربی تہذیب کے پیروکار ہیں۔

لسانی جبر کے خلاف مزاحمت:

ہر ملک کی تہذیب و ثقافت الگ ہونے کے ساتھ ساتھ اس ملک کی زبان بھی اس کی شناخت ہوتی ہے۔ جس علاقے یا جس تہذیب کو ناموافق حالات کا سامنا ہو وہاں پر لسانی جبر بھی پروان چڑھتا ہے۔ اس علاقے کی زبان پر بھی جبر کہا جاتا ہے۔ جب فرانس نے برطانیہ پر حکومت کی تو برطانیہ کی بولی جانے والی زبان انگریزی کو متروک کر دیا گیا اور وہاں فرانسیسی کو فروغ دیا گیا۔ اسی طرح اگر ہندوستان کی بات کی جائے تو ہندوستان میں پہلے فارسی بولی جاتی تھی، پھر فارسی سے ہندی کو عروج حاصل ہوا اور اس کے بعد اردو کو پروان چڑھایا گیا۔

دورِ حاضر کی بات کی جائے تو ابھی بھی ہم لسانی تعصب کا شکار ہیں۔ ہمارے ہاں ہماری قومی زبان کو اتنی اہمیت حاصل نہیں جتنی انگریزی زبان کو حاصل ہے بلکہ اب تو ایسی فضا قائم کر دی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص انگریزی زبان جانتا ہے تو وہ ہی اس معاشرے میں پڑھا لکھا کہلایا جاتا ہے۔ اس کے خلاف مزاحمت کرنے والا وہ طبقہ ہے جیسے اپنی قومی زبان سے لگاؤ ہے اور جو اپنی قومی زبان کو اہمیت دیتا ہے تو اپنی زبان کو فروغ دینا ہی لسانی جبر کے خلاف مزاحمت کا نام ہے۔

نفسیاتی جبر کے خلاف مزاحمت:

کسی بھی شخص کو نفسیاتی حوالے سے دباؤ میں لانا نفسیاتی جبر کہلاتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جس انسان کو نفسیاتی دباؤ میں لایا جارہا ہوتا ہے وہ اس پر ردعمل ظاہر کر دیتا ہے اور مزاحمت پر اتر آتا ہے۔ نفسیاتی جبر کے خلاف مزاحمت میں جو سرِ فہرست ہیں وہ ہمارے معاشرے کے ماہر نفسیات ہیں جو نفسیاتی مریضوں کو اس مصیبت سے باہر لانے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ نفسیاتی جبر میں دھمکی اور جذباتی بلیک میل وغیرہ شامل ہیں جن سے انسان کے ذہن سے کھیلا جاتا ہے اور اسے اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

مزاحمت بطور اصطلاح ادب:

روز اول سے لے کر آج تک انسان کو بدی کی کئی صورتوں سے دوچار ہونا پڑا جس کے خلاف انسان نے مزاحمت اختیار کی جو انحراف، بغاوت، احتجاج اور انقلاب کی صورت میں ہوتی ہے اور انفرادی و اجتماعی مزاحمت کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد مزاحمتی ادب کی اصطلاح کو اس طرح بین کرتے ہیں کہ:

> مزاحمتی ادب ہمیشہ شعوری کاوش اور انسانی جدوجہد کے مثبت رخ کا آئینہ قرار دیا جاتا ہے۔
> مزاحمتی ادب کی اصطلاح کا اطلاق استعمار کی گرفت میں جکڑے یا استعماری اثرات میں اسیر معاشرے کے باشعور فن کار کی مصلحت سوزی، باآواز بلند حق کی گواہی اور آنے والے کل کو اجلا اور روشن بنانے کے خواب کا اعتبار پیدا کرنے کی تخلیقی کاوش پر ہوتا ہے۔ تاہم یہ امر واقعہ ہے کہ

مزاحمتی ادب نے نہ صرف انسانی تہذیب وثقافت کی بنیادر کھی۔۔۔۔۔یہی وجہ ہے کہ ہر باشعور یا باضمیر تخلیق کار فطرتاً آزاد ہوتا ہے اور غلامی مسلط کرنے کی ہر صورت اور ہر کوشش کے خلاف مزاحمت کرتا ہے۔[۲۲]

اب یہاں دو سوالات جنم لیتے ہیں پہلا یہ کہ مزاحمتی ادب کی اصطلاح میں سب سے پہلے کس ملک میں استعمال کی گئی اور دوسرا مزاحمتی ادب سے کیا مراد ہے؟ اس حوالے سے مختلف محققین اور ناقدین کی رائے میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ان میں سے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ مزاحمتی ادب کی اصطلاح فرانس سے شروع ہوئی۔

مزاحمتی ادب کے آغاز اور اس کے پس منظر کے حوالے سے ہم فرانس میں رونما ہونے والے واقعات سے انحراف نہیں کر سکتے۔ جب جرمنی نے تقریباً سات سال تک اپنا غلبہ جمائے رکھا۔ اس حوالے سے کولن جونز (Colin Jones) کہتا ہے کہ:

> The Resistance was never a mass movement in vichy France: at the most: 1 percent of the population was probably actively involved. The circulation of the Resistance press prominent among which the newspapers "Combat" and "Liberation" was about two million, though readership was probably for larger. Listening to BBC radio broadcasts was also an increasingly common clandestime act, which involved even greater numbers of "armchair resisters" (R. Kedward)... yet as the war progressed, it became increasingly apparent that the balance of tacit support was swinging in the Resistance's favour.[۲۳]

اس دور میں جرمنی کے خلاف مزاحمتی تحریک میں کردار ادا کرنے والوں کے خلاف سخت کاروائی کی جاتی؛ خاص طور پر شعرا اور ادبا کو سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

باربرا ہارلو (Barbara Harlow) کی تحقیق کے مطابق مزاحمت کی ادبی اصطلاح سب سے پہلے غسان کنفانی (Ghassan Kanafani) نے استعمال کی۔

> The term Resistance (muqawamah) was first applied in a description of Palestine Literature in 1966 by the Palestinian

writer and critic Ghassan Palestine: 1948-1966.[۲۴]

شہرت بخاری بھی اس ضمن میں اپنی رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ "میرا خیال ہے کہ فلسطینی ادیبوں کی پیروی میں ہم نے مزاحمتی ادب کی اصطلاح کو اختیار کیا ہے۔"[۲۵]

مگر ڈاکٹر صادق آئینہ وند اس کو رد کرتے ہوئے الجزائر کو اس کا مسکن اول قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> کلمہ " ادب المقاومتہ" یا ادبیات مقاومت کی اصطلاح عالم اسلام میں استعمار کے خلاف جنگوں کے دوران مغرب کے عرب ملکوں خصوصاً الجزائر میں رائج ہوئی۔۔۔۔ بعد میں صیہونیوں کے خلاف جنگوں کے دوران میں فلسطین میں مقاومتی شاعری معرض اظہار میں آئی۔[۲۶]

سچ تو یہ ہے کہ ہر دور کے ادب میں مزاحمتی عناصر موجود رہے ہیں لیکن اصطلاحی معنوں میں مزاحمتی ادب کی اولیت کا سہرا فرانسیسیوں کے ادیبوں اور شاعروں کے سر ہے۔ مزاحمتی اصطلاح کو انگریزی میں ہی نہیں بلکہ فرانسیسی میں بھی Resistance سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ ۱۹۴۰ء میں فرانس میں اس اصطلاح کو وضع کیا گیا۔ ڈاکٹر صادق آئینہ وند مزاحمتی ادب کی اصطلاح کا اولین مرکز الجزائر بتاتے ہیں حالاں کہ وہاں مزاحمتی ادب کی اصطلاح ۱۹۵۰ء کی دہائی میں پہلی بار استعمال ہوئی۔ باربرا ہار لو مزاحمتی ادب کی اصطلاح کے بارے میں کہتی ہیں کہ یہ غسان کنفانی فلسطین کی اسرائیل مخالفت کے دوران پہلی مرتبہ استعمال کی گئی۔ اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اس کا سہرا فرانسیسیوں کے سر جاتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر کہتے ہیں کہ:

> مزاحمتی ادب جدید دور کی اصطلاح ہے مگر مزاحمتی رویہ اور اس پر مبنی سوچ اور احساس بے حد قدیم ہے۔ غالباً اتنی ہی قدیم جتنی انسان کی آزاد رہنے کی خواہش۔ مزاحمتی رویہ، مزاحمتی سوچ، مزاحمتی ادب۔۔۔۔ دوسری جنگِ عظیم میں جرمنی کے زیرِ تسلط علاقوں بالخصوص فرانس میں جرمن اقتدار کے خلاف قوم پرست، آزادی پسند اور محب وطن افراد نے جو زیرِ زمین تحریک شروع کر رکھی تھی، اس کے لیے یہ سب الفاظ استعمال ہوتے تھے اور کم و بیش اسی مفہوم میں یہ مروج و مقبول رہے ہیں۔[۲۷]

ڈاکٹر انیس ناگی بھی ژاں پال سارتر کے الفاظ نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ہم کبھی بھی اتنے آزاد نہیں تھے جتنا جرمنوں کے تسلط کے دوران میں تھے۔ ہمیں تمام حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ ہمیں بات کرنے کا حق بھی میسر نہیں تھا۔ ہر روز ہماری توہین کی جاتی تھی اور ہمیں سب کچھ چپ چاپ سہنا پڑتا تھا۔ وہ لوگ جو زیرِ زمین کام کر رہے تھے ان کی کش مکش کے احوال نے ہمیں ایک نئی قسم کا تجربہ عطا کیا۔[۲۸]

مزاحمتی ادب کی اصطلاح متعارف ہونے سے پہلے بھی مزاحمتی ادب موجود رہا ہے۔ اس قسم کا ادب کسی صنف سخن، دبستان، شعرا یا ادب کا محتاج نہیں اور نہ ہی کسی مخصوص علاقے، نسل یا ملک سے تعلق رکھتا ہے۔ اصطلاح معنوں میں صاحبان ادب نے اسے کئی طرح سے بیان کیا ہے مگر اس کی جامع اور قابل قبول تعریف آسان نہیں ہے کیوں کہ مختلف ادیبوں کے ترجمان، شاعر اور ادیب مزاحمتی ادب کی کسی ایک تعریف پر آمادہ نہیں ہیں۔ ان کی تعریفوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اس کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> اگر مزاحمتی ادب سے مراد وہ ادب ہے جو معاشرے کو جبر، ناانصافی، ظلم، نشہ وغیرہ سے نجات دلانے کے لیے ظالم سے آمادہ جنگ کرتا ہے تو ہر لکھنے والے کی کوئی نہ کوئی تحریر اس ضمن میں شمار کی جاسکتی ہے۔[۲۹]

مزاحمتی ادب کے حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادیب طبقہ چاہے کسی بھی سماج سے تعلق رکھتا ہو، جب وہ اپنے سماج میں ظلم، جبر، استحصال ہوتا دیکھتا ہے تو اسے قلم بند ضرور کرتا ہے اور ناانصافی کے خلاف قلم کے ذریعے آواز اٹھاتا ہے۔ پھر چاہے وہ ادیب فرانس کا ہو یا ہندوستان کا، جب وہ ظلم ہوتا دیکھتا ہے تو اسے محسوس کر کے اس کو لفظوں کی شکل میں سمو دیتا ہے۔ اس حوالے سے ادیبوں اور شاعروں پر بھی جبر کیا جاتا اور انھیں کھل کر لکھنے کی اجازت نہ ہوتی تو وہ تب بھی لکھتے اور ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنی بات کو دنیا تک پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے۔ گویا ہر معاشرے کا ادیب طبقہ اپنی حکومتی پالیسیوں اور معاشرے میں جبر و استحصال کے خلاف قلم سے احتجاج کرتے ہیں۔ اس ضمن میں جو ادب تخلیق کیا جاتا ہے اسے مزاحمتی ادب کا نام دیا جاتا ہے۔

اردو ادب میں مزاحمت کی روایت

بین الاقوامی ادب کے منظرنامے پر باقی زبانوں کی طرح اردو ادب میں بھی مزاحمت کی ایک مضبوط روایت موجود ہے۔ اردو زبان و ادب کا آغاز ایسے دور میں ہوا جب ہندوستان سیاسی، معاشی اور تہذیبی طور پر مسائل کا شکار تھا۔ اردو ادب میں مزاحمت کی روایت مغلیہ سلطنت کے زوال سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد انگریزوں کی ہندوستان میں آمد کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں اپنے قدم مضبوط کر کے ہندوستانیوں کو غلام بنانے کی کامیاب کوششوں نے اس عہد کو نقصان پہنچایا۔ ڈاکٹر رشید امجد اس عہد کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> مزاحمت ہمارے ادب کے خمیر میں رچی بسی ہے کہ اردو ادب کا آغاز جس دور میں ہوا، وہ سیاسی انحطاط اور معاشرتی و تہذیبی زوال کا عہد ہے۔ اٹھارویں صدی کے آغاز سے اس زوال کی ابتدا ہو گئی تھی اور یہ زوال بنیادی طور پر سیاسی انحطاط کا نتیجہ تھا۔[۳۰]

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد ہندوستان کا سارا نظام درہم برہم ہو گیا۔ انگریزوں نے مجاہدین پر قابو پا لیا اور اس کے بعد مسلمانوں کو مشکلات و مصائب سے دوچار کرتے رہے۔ انھیں ہر طرح سے اپنا محکوم بنا لیا۔ ہندوستانی عوام کا قتل عام کرنے کے ساتھ عورتوں اور معصوم بچوں کو بھی نہ بخشا۔ ظلم و تشدد کی اگر مثال دی جاتی تو ہندوستان پر ۱۸۵۷ء کے بعد جو ظلم ہوا، اس کی مثال نہیں ملتی۔

ہندوستانیوں نے جب یہ ظلم سہے تو اس کے بعد ان کے اندر انقلاب کا جوش نمایاں ہوا اور وہ انگریزوں سے خود پر کیے گئے ظلم سے چھٹکارا حاصل کرنے کا سوچنے لگے۔ اس انقلاب کی وجہ سے ہندوستانیوں کی زندگی یکسر بدل گئی۔ ہندوستانیوں نے خود کو تبدیل کرنے کے لیے نئے نئے نظریات سیکھے۔ ان نظریات پر عمل کیا۔ ہندوستانی عوام نے تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ انگریزی زبان سیکھی تاکہ وہ انگریزوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکیں۔ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لوگوں کے کئی راستے آسان ہو گئے اور اس طرح ہندوستان انقلاب کی سیڑھی چڑھنے لگا۔ جنگِ آزادی کے بعد لوگوں میں سیاسی آزادی کا شعور جنم لینے لگا۔ اس شعور کی وجہ سے لوگ خود کو مضبوط کرنے لگ گئے۔ وطن پرستی کا جذبہ پروان چڑھا تو ان کے لیے تمام مشکلات خود بخود حل ہونے لگ گئیں۔

جب کسی بھی قوم کا حساس طبقہ غربت، افلاس، ظلم اور تشدد میں گھرا ہوتا ہے اور اسے شخصی آزادی چھین لی جاتی ہے تو اس کے بعد وہ اس ظلم و تشدد اور غلامی کے خلاف مزاحمت کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس طبقے میں شاعر اور ادیب جو کچھ محسوس کرتے ہیں انھیں اپنے لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں۔ جب معاشرے میں وہ ظلم اور استحصال ہوتا دیکھتے ہیں تو اس کے خلاف لفظی مزاحمت کا اظہار کرتے ہیں اور لفظوں کے ذریعے جدوجہد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اردو ادب میں مزاحمت کی روایت کو دیکھیں تو اٹھارویں صدی میں یہ کسی شکل میں نظر نہیں آتی۔ البتہ انیسویں صدی بالخصوص جنگِ آزادی کے بعد اردو ادب میں اس تحریک نے زور پکڑ لیا۔ چاہے وہ ادب نثری تھا یا شعری، اس میں مزاحمت ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ عتیق احمد اس مزاحمتی ادب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> انیسویں صدی کے شعری اور نثری ادب میں تو اجتماعی احساس اور احتجاج کی رو بہت کچھ نکھر چکی تھی، لیکن اٹھارویں صدی میں یہ لہجہ کسی مسلسل روایت کی شکل میں نہیں ملتا۔[۱۳]

جعفر زٹلی اردو شاعری میں مزاحمتی ادب کے حوالے سے ایک بہت بڑا نام ہے۔ ان کی شاعری میں چاہے وہ غزل ہے، نظم یا ہجو، احتجاجی رویہ دیکھنے کو ملتا ہے اور اسی احتجاجی اور مزاحمتی رویے کی وجہ سے بادشاہ فرخ سیر نے انھیں پھانسی کی سزا دے دی تھی۔ ان کی شاعری میں طنز، ہجویات اور شہر آشوب میں مزاحمتی رویے نمایاں نظر آتے ہیں۔ تبسم کاشمیری کہتے ہیں کہ:

وہ پہلا اردو کا شاعر تھا جس نے اپنے دور کی معنویت ، بے ربطی اور زوال کی نشان دہی کی ہے۔۔۔۔ مغلیہ دور کی معاشرتی، ریاستی اور سیاسی بے ربطی نے اٹلی کو ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کر دیا تھا جہاں وہ رنج و غم کی حالت میں اپنے عہد کے زوال کا پُر سوز نوحہ سپرد قلم کرتا ہے۔

انیسویں صدی میں ایک اہم نام مرزا غالب کا تھا۔ مرزا غالب نے مغلیہ دور حکومت کے زوال سے لے کر انگریزوں کی حکومت، انگریزوں کا ہندوستان پر ظلم و ستم، معاشرتی استحصال کو دیکھا، اسے محسوس کیا اور اس پر قلم اٹھائی۔ ان تمام واقعات کو الفاظ کی شکل میں ڈھال دیا۔ اس سب کے رد عمل کے طور پر غالب نے مزاحمتی رویہ بھی اختیار کیا۔ اپنی شاعری میں ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی بربادی کا آئینہ بھی دکھایا۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد قوم دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک گروہ سرسید احمد خان اور ان کے رفقا کا تھا جنھوں نے مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے مسلمانوں کو بے مقصد اور بے معنی زندگی سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔ عوام کے اندر یہ شعور پیدا کیا کہ اگر انھوں نے زندگی میں آگے بڑھنا ہے اور انگریزوں کا مقابلہ کرنا ہے تو اس سے پہلے انھیں جدید علوم سیکھنا ہوں گے اور کچھ حد تک انگریزوں سے مفاہمت کرنی ہو گی۔ کیوں کہ جنگِ آزادی کے بعد ہندو قوم انگریزوں کی طرف دار بن گئی تھی اور مسلمانوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ مسلمان بھی تعلیم حاصل کریں اور ان کا مقابلہ کر سکیں۔ اس کے لیے سرسید احمد خان نے دن رات محنت کی۔ ان کی ادبی کاوشوں میں رسالہ "تہذیب الاخلاق" شامل ہے۔ اس رسالے کے ذریعے سرسید نے قوم کو زندگی میں علوم و فنون سیکھنے اور ترقی کرنے کے لیے شب و روز محنت کی۔ دوسرا گروہ وہ تھا جو انگریزوں کے مخالف تھا، جو انگریزی زبان کی مخالفت کرتا تھا۔ انھوں نے سرسید کے خیالات کو طنز کا نشانہ بنایا۔ سرسید کے خیالات کے خلاف مزاحمتی طور پر رسالہ "اودھ پنچ" نکالا گیا۔ اس کے بعد اکبر الٰہ آبادی کی شاعری میں بھی ہمیں مزاحمتی رویہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ انھوں نے سرسید کی تحریک سے جنم لینے والی تبدیلیوں کے خلاف مزاحمت کی۔ اس وقت مسلمانوں میں جدید علوم سیکھنے کی وجہ سے جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں، انھیں طنز اور مزاحمتی انداز میں پیش کیا اور بتایا کہ مغربی تہذیب نے انھیں اندھا کر دیا ہے۔ روبینہ سہگل اس مزاحمتی رویے کے بارے میں لکھتی ہیں کہ:

اکبر کی شاعری ایک شخص کی سماجی تبدیلی اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف مزاحمت تھی۔ مزاحمت کا تعلق بہت حد تک شناخت اور ذات سے ہوتا ہے۔ اس احساس نامردی کا جدید دور کے ہندوستان مرد پر بہت گہرا اثر تھا۔ [۲۳]

انیسویں صدی کے اختتام تک سرسید اور ان کے رفقا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد، نواب محسن الملک اور مولوی ذکا اللہ نے سرسید کے اس مشن کو آگے بڑھاتے رہے اور بیسویں صدی میں جدید علم و

ادب متعارف کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔

۱۸۶۷ء کے لگ بھگ انجمن پنجاب کے جلسوں میں مشاعروں کی تجویز دی گئی۔ محمد حسین آزاد نے مشاعروں کے ذریعے شاعری میں نیا انداز رائج کرنے کی ابتدا کی۔ ابتدا میں مشاعرے روایتی ہوا کرتے تھے مگر انگریز سرکار کی دل چسپی کے بعد موضوعاتی ہو گئے اور اس طرح شاعری میں نئے پن کا آغاز ہوا۔ مولانا حالی، شبلی اور آزاد نے اردو نظم کو ایک صنف کے طور پر متعارف کروایا۔ اس طرح اردو نظم میں بھی انقلاب برپا ہوا جو کہ غزل کے خلاف آواز تھی۔ حالی نے "مسدس حالی" میں انگریز سرکار کے خلاف مزاحمتی رویہ اپنایا۔

تحریک علی گڑھ کے رد عمل میں رومانوی تحریک کو فروغ حاصل ہوا جس نے سرسید کی عقلیت پسندی کی مزاحمت کر کے اسے رد کرتے ہوئے مظاہر فطرت اور انسانی تخیل کی پرواز کو زیادہ اہمیت دی۔

علامہ اقبال بیسویں صدی کے بہت بڑے شاعر ہیں انھوں نے اشتراکیت، وطنیت اور خودی کے متعلق اپنا نقطۂ نظر واضح طور پر پیش کیا۔ اس دور میں اقبال کے ہاں فطرت اور جمال کی تصویر کشی کرنے کے بجائے انسان کے باطن میں جھانکنے کا رجحان موجود ہے۔ اقبال کے ہاں رومانویت کا ایک رُخ ماضی کی عظمت کو اجاگر کر کے مسلمانوں کو پھر سے خود پر اعتماد دلانا ہے۔ "انقلاب کا لفظ اقبال نے سب سے پہلے اپنی شاعری میں استعمال کیا اور سیاسی انقلاب کا تصور بھی اردو شاعری کو اقبال نے عطا کیا۔"[۳۴]

رومانوی تحریک سے منسلک شاعروں، ادیبوں اور نثر نگاروں میں اقبال، اختر شیرانی، ابوالکلام آزاد، حفیظ جالندھری، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، عبدالحلیم شرر اور مجنوں گورکھ پوری شامل ہیں۔ انھوں نے فکشن (ناول، افسانہ) اور شاعری میں منفرد انداز میں مزاحمتی رویہ اپنایا۔

رومانوی تحریک کے رد عمل میں حقیقت نگاری کی تحریک وجود میں آئی جس نے بعد میں ترقی پسند تحریک کا نام لے لیا۔ ترقی پسند تحریک کے علم برداروں نے ادب کا رشتہ سماج سے جوڑا اور کارل مارکس کے نظریے کی پیروی کی۔ انھوں نے اقبال اور اختر شیرانی کی رومانوی شاعری سے بغاوت کرتے ہوئے جو ادب تخلیق کیا اس میں مزاحمت کا عنصر پایا جاتا ہے جو اس وقت کا ادب کہلایا جانے لگا۔

ترقی پسند تحریک کا آغاز کرنے والوں میں منشی پریم چند، سجاد ظہیر، اختر حسین رائے پوری شامل ہیں۔ انھوں نے معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف عوام کے ضمیر کو جگانے کی کوشش کی۔ بیسویں صدی میں جب "انگارے" شائع ہوا تو اس نے ادب کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ ترقی پسند تحریک کی یہ پہلی مزاحمت تھی، اس کے سبب تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اس تحریک کا مقصد معاشرے کی غیر منصفانہ تقسیم کا خاتمہ اور مزدور طبقے کے حق میں آواز اٹھانا تھا۔ ترقی پسند تحریک کا پہلا اجلاس ۱۹۳۶ء میں منشی پریم چند کی قیادت میں لکھنؤ میں ہوا۔

ہماری کسوٹی پر وہی ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں کیوں کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہے۔[۳۵]

ترقی پسند شاعروں اور نثر نگاروں نے اس وقت کے معاشرتی استحصال کے خلاف آواز اٹھائی، معاشرے میں ظلم و ستم کے خلاف اور نچلے طبقے کی حمایت میں آواز بلند کی۔ پریم چند نے افسانوں کو داستانوی ماحول سے نکال کر حقیقی زندگی کی طرف لانے کی کامیاب کوشش کی۔ کرشن چندر نے انسان کی باطنی محرومیوں کے خلاف مزاحمتی انداز اپنایا۔ شعرا اور افسانہ نگاروں نے دوسری جنگِ عظیم اور تقسیم ہند تک معاشرے میں ہونے والے فسادات، ظلم و ستم، معاشرتی ناانصافیوں اور مزدور طبقے کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے مزاحمتی انداز اپنایا۔

ناول نگاری کی بات کی جائے تو ڈپٹی نذیر احمد کا ناول "ابن الوقت" مزاحمتی رویوں کی بہترین عکاس ہے جس میں انگریزوں کی غلط پالیسیوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ انگریز سرکار کا عوام کے ساتھ غیر اخلاقی رویہ سر فہرست ہے۔ کس طرا انگریز سرکار عیسائیت کو فروغ دینے کی کوششیں کرتی رہی، اس کی بھی نشان دہی کی گئی۔ مجموعی حوالے سے ابن الوقت پورے ناول میں ہندوستان میں انگریز سرکار کی عوام کے ساتھ کی گئی ناانصافیوں پر تقاریر کرتا ہے اور انگریزوں کے خلاف مزاحمتی رویہ اختیار کرتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ناول "رویائے صادقہ" میں بھی انگریز حکومت پر طنز کے تیر چلائے گئے۔ انگریز حکومت لوگوں سے ٹیکس وصول کرتی ہے اور پھر وہ عوام پر ساری خرچ نہیں کرتی جو کہ عوام کے ساتھ ناانصافی ہے۔

پریم چند ناول نگاری میں اپنی مثال آپ ہیں۔ پریم چند نے جس دور میں آنکھ کھولی وہ جاگیردارانہ دور تھا۔ غریبوں اور کسانوں کی زندگیاں جانوروں سے بھی بدتر تھیں۔ انھیں ان کے حقوق سے محروم رکھا جاتا تھا۔ ان سے کام لیا جاتا تھا مگر اس کے عوض انھیں بہت کم دیا جاتا تھا۔ اگر کوئی غریب اس کے خلاف بات کرتا یا اپنا حق مانگتا تو اسے سخت سزا دی جاتی۔ پریم چند نے یہ سب اپنی زندگی میں ہوتے ہوئے دیکھا۔ ان حالات میں پریم چند نے قلم کے ذریعے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ انھوں نے یہ عزم کیا کہ وہ بدی کے خلاف آواز اٹھائیں گے اور معاشرتی ناہمواریوں کو دور کریں گے۔ اپنے ناولوں کے ذریعے پریم چند نے نچلے طبقے کو خواب غفلت سے جگایا۔

پریم چند کے ناول "بازار حسن" اور "چوگان ہستی" میں مزاحمتی رویہ پایا جاتا ہے۔ "بازار حسن" میں طوائف کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار "سمن" اپنے گھر سے نکل کر طوائف کے گھر رہنے لگتی ہے۔ یہاں سماجی مزاحمت کو اپنایا گیا ہے۔ اس ناول میں پریم چند نے معاشرتی خرابیوں اور نفسیاتی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ "چوگان ہستی" میں پریم چند نے محنت کش مزدوروں اور کسانوں کے مسائل کی عکاسی کی ہے۔ ناول میں

صنعتی تہذیب سے پیدا ہونے والے مسائل کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ ناول میں مرکزی کردار" سورداس" نے گاندھی کے عدم تشدد کے نظریے کو اپنا کر احتجاجی انداز اپنایا۔

۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیان لکھے جانے والے ناولوں کے موضوعات میں زیادہ تر استحصال، ناانصافی، سماجی گھٹن اور انگریزی سامراجیت کے خلاف مزاحمتی رویے ملتے ہیں۔ اس حوالے سے عصمت چغتائی کا ناول "ٹیڑھی لکیر" اور "ضدی" نمایاں ہیں۔ عصمت چغتائی نے ناولوں میں رنگ و نسل کی بنا پر کی جانے والی تفریق اور نچلے طبقے کے استحصال کے خلاف آواز اٹھائی۔

عصمت چغتائی کا ناول "ٹیڑھی لکیر" مزاحمت کی بہترین مثال ہے۔ ناول میں متوسط طبقے کی لڑکیوں کی نفسیاتی کش مکش کے ذریعے سماجی پہلوؤں کو احتجاجی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ناول میں شمن کا کردار احتجاجی علامت ہے۔ اس کردار کے بارے میں اپنے ناول کے پیش لفظ میں لکھتی ہیں کہ:

> شمن کی کہانی کسی ایک لڑکی کی کہانی نہیں ہے۔ یہ ہزاروں لڑکیوں کی کہانی ہے۔ اس دور کی کہانی ہے جب وہ پابندیوں اور آزادی کے بیچ ایک خلا میں بھٹک رہی ہیں اور میں نے ایمان داری سے ان کی تصویر ان صفحات کھینچ دی ہے تاکہ آنے والی لڑکیاں اس سے ملاقات کر سکیں کہ ایک لڑکی ٹیڑھی ہوتی ہے۔[۳۶]

عزیز احمد نے اپنے ناولوں میں جنگِ عظیم اول اور دوم کے دوران سیاسی، معاشی بحران کے اسباب بیان کیے ہیں۔ "گریز" میں انگریز سامراجیت کی ہندوستان میں استحصالی نظام پر سخت مزاحمت کی ہے۔ ناول "آگ" میں کشمیریوں کے مسائل کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے ظلم و ستم اور جبر و استحصال کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ناول میں سامراجیت کے خلاف مزاحمتی رویہ اپنایا گیا ہے۔

مختصراً تقسیم سے قبل اردو ناولوں میں جہاں زیادہ تر انگریز حکومت کے خلاف قلم کے ذریعے احتجاج کیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ نچلے طبقے اور کسانوں کو بھی زندگی میں آگے بڑھنے کی تلقین کی گئی۔ ہندوستانی کسانوں کے استحصال کو موضوع بنایا گیا۔ ڈپٹی نذیر احمد سے لے کر عزیز احمد تک جتنے بھی بڑے ناول نگار ہیں انھوں نے ظلم اور تشدد کے خلاف اپنی قلم کا استعمال کیا اور معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کیا۔

نولکھی کوٹھی میں نو آبادیات کے خلاف مزاحمتی عناصر

علی اکبر ناطق کا ناول "نولکھی کوٹھی" ہندوستانی نو آبادیات اور تقسیم ہند پر لکھا گیا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی خطہ ہو، وہاں کے باشندے کبھی یہ گوارا نہیں کرتے کہ ان کے خطے پر کوئی غیر قوم آکر حکومت کرے اور انھیں اپنا غلام بنالے مگر طاقت ور قومیں اپنے رعب اور ظلم کے بل پر دوسرے ملکوں پر حکومت کرتی آئی ہیں اور ان کے وسائل کو اپنے لیے استعمال کیا جاتا رہا۔ جب کوئی ملک کسی ملک پر اپنی طاقت کے سبب حکومت کرتا ہے تو اس ملک کے باشندے اس کے خلاف ہوتے ہیں لیکن ان کے پاس اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ مقابلہ کر سکیں۔ اس لیے وہ ان کی حکومت کو بظاہر قبول تو کر لیتے ہیں مگر انھیں تہہِ دل سے قبول نہیں کرتے۔ "نولکھی کوٹھی" میں بھی انگریز ہندوستان پر حکومت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور عوام پر اپنا رعب بھی جمایا ہوا ہے مگر ہندوستانی عوام دل ہی دل میں ان کے خلاف مزاحمتی انداز اپنائی ہوئی ہے اور مختلف طریقوں سے انگریز حکومت کی مزاحمت کرتی ہے۔ اگر وہ مزاحمت نہیں کرتے پھر بھی دل ہی دل میں انھیں کوستے رہتے ہیں۔

> سودھا سنگھ سے بالواسطہ مخاطب ہونا اور بے پروائی سے پرنام کا جواب دینا ایسی گستاخی تھی جس نے اس کی طبیعت کو نہایت منغض کیا۔ اس نے سوچا کہ سب قسمت کے کھیل ہیں، ورنہ اس گوری چمڑے کے چھ فٹ بالکے کی کیا حیثیت تھی۔ ابھی زمین میں کلے کی طرح گاڑ کر ساتھ ڈاچی باندھ دیتا یا پھر چھدو سے کہتا کہ اسے ذرا جھانبڑ پھیر اور بیلنے پر بیلوں کی جگہ اس فرنگی کو جوت دیتا ۔ مگر اب کیا کیا جاسکتا تھا آخر سرکار انگریزی کی تھی۔[۳۷]

چوں کہ سودھا سنگھ کا اپنے گاؤں میں بڑا اثر و رسوخ تھا۔ ان سب کے سامنے وہ اپنی ذلالت برداشت نہ کرتے ہوئے بھی سن رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس انگریز کو زندہ دفن کر دے اور اس سے سخت رویے سے پیش آئے مگر وہ اس انگریز کے سامنے کچھ نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ ہندوستان میں اس وقت انھی کی حکومت تھی۔ اگر اس کے ساتھ بد تمیزی بھی کرتا تو سزا پاتا۔ اسی لیے اسے دل ہی دل میں کوستا رہا۔

انگریزوں کے خلاف ناول میں کئی جگہ مزاحمتی رویے پائے جاتے ہیں۔ انگریزوں کی حکومت میں سرِ عام تو ان کے خلاف مزاحمت نہیں کی جاسکتی تھی لیکن دل ہی دل میں، ان کی پیٹھ پیچھے ان کے خلاف باتیں کرنا اور بغاوت کرنا اس دور کے باشندوں میں شامل تھا۔ اس دور میں ہر ایک کو انگریزوں سے ڈر لگتا تھا۔

> میری مان سودھا سنگھ، غلام حیدر سے صلح کر لے، یہ فرنگ بڑے بُرے ظالم ہیں۔ ظالموں میں ذرا ترس نئیں۔ بڑے سے بڑے سردار سے نہیں ڈرتے۔[۳۸]

ناول "نولکھی کوٹھی" نہ صرف تقسیم ہند سے قبل کی معاشرتی صورت حال کی عکاس ہے بلکہ تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں اور ہندوؤں کا ایک دوسرے کے لیے نفرت بھرے رویے کو بھی فاش کرتا ہے۔ تقسیم ہند سے قبل ہندوستانی باشندے انگریزوں کی حکومت کو قبول کیے ہوئے تھے مگر انھوں نے اس حکومت کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ اس وقت ہندوستانی عوام کے حوصلے پست تھے، انھیں خود پر اعتماد نہیں تھا۔ اس وقت ہندوستانی عوام میں اکثریت ایسی تھی جنھوں نے اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ وہ انگریزوں کے غلام ہیں۔ انھیں اس سے فرق نہیں پڑتا تھا کہ ان پر انگریزوں کو مسلط کر دیا گیا ہے۔ وہ خود کے لیے آواز نہیں اٹھا سکتے تھے اور اس کا انگریزوں نے فائدہ اٹھایا۔ ہندوستانی عوام کو ڈرا دھمکا کر رکھتے تھے تاکہ وہ انگریز حکومت کے خلاف بات کرنے سے بھی کترائیں۔ انگریزوں نے یہ جان لیا تھا کہ ہندوستانی عوام ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اس لیے ناول کے آغاز میں کہیں بھی نوآبادیاتی مزاحمت نہیں دکھائی دیتی۔ اس کی وجہ انگریز حکومت کا رعب اور تسلط ہے۔ ہندوستانی عوام میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ انگریز حکومت کا مقابلہ کر سکیں۔

ناول کے آغاز میں کہیں بھی مزاحمت نظر نہیں آتی۔ چاہے وہ مزاحمت انفرادی طرز پر ہو یا اجتماعی طرز پر۔ ہندوستانی کی عوام میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ انگریزوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کریں یا اپنے حقوق کے لیے ان سے تکرار کریں۔ انگریزی حکومت کے چرچے تھے وہ جیسا چاہتے تھے ویسا کرتے تھے۔ اس وقت کوئی بھی ان کے خلاف مزاحمت کا نہیں سوچتا تھا مگر ایک بات ہندوستانی عوام کو معلوم تھی کہ انگریز حکمران ان کے مفاد کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ وہ جو بات بھی کرتے ہیں اس کے پیچھے ان کے اپنے مقاصد ہوتے ہیں اور وہ صرف اور صرف ہماری سرزمین سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یہ باتیں وہ انگریزوں کو نہیں کہہ سکتے تھے مگر انھیں ان باتوں کا علم ہوا تو آپس میں ان باتوں پر ضرور بحث کیا کرتے تھے۔ یہ مزاحمت کی نچلی سطح ہے جسے ہم بغاوت کا نام دے سکتے ہیں کہ دل ہی دل میں بغوت کرنا یا ان کے پیٹھ پیچھے ان کے خلاف ایسی باتیں کرنا جو ان کے سامنے نہیں کہی جا سکتی تھیں۔ ناول میں پہلے تو ہمیں بغاوت کی کئی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں کیوں کہ اس وقت عوام میں اتنا جوش و جذبہ اور شعور نہیں تھا کہ وہ انگریزوں کے خلاف ڈٹ کھڑے ہوتے۔ اگر ایسا ہوتا تو انگریز ہندوستان میں نظر نہ آتے۔ اس لیے اگر ہم دیکھیں تو پہلے ہمیں بغاوت دیکھنے کو ملتی ہے۔ ڈھکے چھپے الفاظ میں انگریزوں کے پیٹھ پیچھے ایک دوسرے سے ان کے ارادوں اور منصوبوں پر بحث کی جاتی تھی۔

> رہی بات انگریز سرکار کی، تو یہ کبھی ہوتی تھی جب انھوں نے دلی نئی نئی فتح کی تھی۔ اب کے بھی کچھ اور یہی لچھن ہیں۔ کیا تو نہیں دیکھتا؟ یہ انگریزی بابو اور میمیں یہاں کتے لڑانے، زمینیں خریدنے، کبوتر اڑانے اور کوٹھیاں بنانے کا دھندا کھلے کھیتوں کرتے ہیں اور یہ سب عیاشیاں

رشوت کے بغیر نہیں ہوتیں۔ میرے بھائی کے بیٹے یہ رشوت کا خون ان کے منہ کو بھی لگ چکا ہے۔ ہاں ایک بات ضرور ہے جہاں دیسی ولا دس لیتا ہے، یہ گورا بیس لیتا ہے۔ مُل میں فرق ہے کرتوت میں نہیں رہا۔[۳۹]

اس اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہندوستانیوں کو انگریز حکومت کی چالوں کی سمجھ آگئی تھی۔ ہندوستانی عوام نے بھانپ لیا تھا کہ انگریز یہاں صرف اپنی تجوریاں بھرنے آئے ہیں اور اپنے ملک کے مفاد کی خاطر ہمارے حقوق کا استحصال کر رہے ہیں۔ انگریز ہندوستان پر حکومت کر رہے تھے مگر ہندوستانی عوام کو سمجھ آنے لگ گئی کہ یہ ہمارے حقوق پر ڈاکا ڈال رہے ہیں مگر ہندوستانی عوام اس وقت آمنے سامنے انگریزوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی مگر جہاں کہیں ان کے بس میں ہوتا انھیں موقع ملتا تو وہ انگریز حکومت کے خلاف مزاحمتی رویہ اپناتے تھے۔ چوں کہ انگریز اقتدار میں تھے اور ہندوستانی عوام کمزور تھی۔ اس لیے جہاں موقع ملتا تھا وہ انگریزوں کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اسکی مثال ہمیں ناول میں کئی جگہ ملتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

ان کے خیال میں گورنمنٹ نے نہر کے پانی میں ایسی دوائی ملا رکھی ہے جس سے فصلوں میں بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ جب اس فصل کا غلہ لوگ استعمال کرتے ہیں تو وہ بیماری لوگوں میں پھیل جاتی ہے یعنی انسان نامرد ہو جاتا ہے اور نسل آگے نہیں بڑھتی۔ اس لیے یہ لوگ نہر کا پانی ہی فصلوں کو لگنے نہیں دیتے اور مکمل طور پر بارشوں کے سہارے رہتے ہیں۔[۴۰]

جب ہندوستانی عوام میں شعور پیدا ہونے لگا، اس وقت کے حالات کے مطابق عوام کسی نہ کسی صورت میں انگریز حکومت سے مزاحمت کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ ہندوستانی عوام کو زیادہ اختیارات حاصل نہیں تھے کہ وہ بڑے بڑے فیصلے کرتی۔ کیوں کہ تمام اختیارات حکومت نے اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے تھے۔ اس لیے جہاں جہاں عوام کو اختیار حاصل تھا وہ وہاں حکومت کے خلاف مزاحمتی رویے اپناتے ہوئے نظر آتی ہے۔

اس وقت مسلمان اپنے بچوں کو مساجد میں تعلیم دیتے۔ اپنے بچوں کو سکول نہیں جانے دیتے تھے کیوں کہ انھیں ایسا لگتا تھا کہ اگر ان کے بچے سکولوں میں تعلیم حاصل کرنے گئے تو وہ اپنے مذہب سے دوری اختیار کر لیں گے۔ نظام تعلیم انگریزوں کے ہاتھ میں تھا۔ انگریز ہی فیصلہ کرتے تھے کہ سکولوں میں کس طرح کی تعلیم دی جائے۔ اس لیے ہندوستانی بالخصوص مسلمانوں نے اپنے بچوں کو سکول میں تعلیم دینے سے گریز کیا۔

یہ انگریزی سکولوں میں تو کرستان کا علم ہے۔ ان سکولوں میں جا کر ہمارے بچے کرستان ہو جائیں گے اور دین خراب ہو جائے گا۔ تم نے فرنگی سرکار سے پیسے کھا لیے ہیں۔[۴۱]

مسلمانوں کی اس بات میں سچائی بھی تھی کیوں کہ یہ انگریزوں کی سازش تھی کہ ہندوستانی بچوں کو ایسا علم اور ایسی تعلیم دی جائے جس سے وہ اپنے مذہب سے دوری اختیار کرتے ہوئے عیسائیت کو اپنالیں۔ اس منصوبے کے تحت انھوں نے اپنے ملک سے پادریوں کو بھی ہندوستان بلایا تا کہ وہ عیسائیت کو فروغ دیں اور آنے والی نسل عیسائیت کو قبول کر لے تو ہمارے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکیں گے اور ہم اپنے منصوبوں میں کامیابی حاصل کرتے رہیں گے۔

انگریز سالوں سے برصغیر پر حکومت کر رہے تھے اور اتنا رعب جمایا ہوا تھا کہ ان کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھاتا تھا۔ انھوں نے ایسا نظام بنایا ہوا تھا کہ ہندوستان چپ چاپ ان کی غلامی کر رہے تھے۔ اپنے ملک میں ہوتے ہوئے بھی آزاد نہیں تھے مگر جب دوسری جنگ عظیم رونما ہوئی تو اس کے بعد حالات یکسر بدل گئے۔ اب برطانوی حکومت بھی وسائل کی کمی کا شکار ہونے لگی۔ کیوں کہ ہٹلر نے بہت بری طرح برطانوی حکومت کا گودا کھینچ لیا جس کی وجہ سے برطانوی حکومت کا ہندوستان میں نوآبادیاتی اقتدار قائم رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی مختلف قسم کی تبدیلیاں رونما ہونے لگ گئی تھیں۔ ہندوستان کی عوام بھی اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ ان میں شعور آنے لگ گیا تھا اور آہستہ آہستہ انھیں اس بات کی سمجھ آ رہی تھی کہ وہ آزاد ہیں، ان پر غلامی مسلط کی گئی ہے۔ وہ ہندوستان جو کئی سالوں سے انگریزوں کی غلامی کر رہا تھا، ان کے ظلم وستم اور جبر واستحصال کو برداشت کر رہا تھا۔ اب انھیں انگریزوں کی چالوں کی سمجھ لگ گئی اور وہ اپنے ملک کی سلامتی کے لیے انگریزوں سے آنکھیں ملا کر بات کرنے لگ گئے جہاں کچھ عرصہ پہلے کی بات کی جائے تو وہ ہندوستانی عوام جو انگریز حکمرانوں کے سامنے کچھ بھی کہنے سے ڈرتی تھی۔ اب سرعام اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے لگ گئی۔ پہلے جہاں انگریزوں کی پیٹھ پیچھے بغاوتی رویہ اپنایا جاتا تھا، اب ان کے سامنے وہی رویہ مزاحمت اختیار کرنے لگ گیا:

> اب ہندوستانی بھی پہلے والے نہیں رہے تھے۔ اب یہ لوگ چالاکی اور عیاری میں گوروں کے بھی کان کاٹتے تھے اور اس چکر میں تھے کہ کب انگریز یہاں سے نکلیں؟ ایسے میں انھیں آزاد نہ کرنا ایسے ہی تھا، جیسے بغیر ہتھیار کے بھیڑیے کے ساتھ رات گزاری جائے۔ [۴۲]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے لوگوں نے اپنے حق کے لیے کس طرح آواز اٹھائی۔ جب کوئی قوم کسی دوسری قوم کی غلامی کر رہی ہو اور پھر اسے غلامی کی زنجیریں توڑ دینے کا جوش اور جذبہ پیدا ہو جائے تو اس حاکم قوم کے لیے اس سے زیادہ خطرے والی بات کوئی نہیں ہے۔ کیوں کہ پھر وہ غلام قوم اپنا حق لے کر رہتی ہے اور جس حد تک جانا پڑے، وہ جاتی ہے۔ کیوں کہ وہ جاگ جاتی ہے، اس میں شعور آجاتا ہے۔ بالکل ایسی ہی صورت حال ہندوستان میں بھی رونما ہوئی۔ جب ہندوستانی عوام نے غلامی کی زنجیریں توڑ پھینکنے کا عزم کیا تو انگریزوں کو یہاں

سے بھاگنا پڑا۔ کیوں کہ ان کی زندگیاں خطرے میں پڑ گئی تھیں۔ انھوں نے ماضی میں جو ظلم کیے اور جس طرح ہندوستان کو لوٹا، انھیں اپنے بارے میں سب معلوم تھا، اسی لیے انھوں نے بھلائی اسی میں سمجھی کہ یہاں سے بھاگ جائیں ورنہ اگر ہندوستانی عوام نے بدلہ لینا شروع کیا تو ان کے ہاں کچھ نہیں بچتا تھا۔

ہندوستان کی صورت حال کی بات کی جائے تو اک طرف تو ہندوستانی عوام غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھی تو دوسری طرف کچھ فسادات بھی شروع تھے۔ چوں کہ ہندوستان میں دو بڑے گروہ آباد تھے، ہندو اور مسلم۔ یہ دونوں گروہ اس بات پر متفق تھے کہ انگریزوں کی غلامی نہیں کرنی مگر اس کے ساتھ ساتھ ان دونوں گروہوں کی آپس میں نہیں بنتی تھی تو یہ دونوں ایک ساتھ رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ جب انگریزوں سے نجات مل رہی تھی، اس وقت ہندو مسلم فسادات بھی شروع تھے اور دونوں گروہوں کا یہی مطالبہ تھا کہ انھیں الگ الگ وطن دیا جائے۔ ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس کے لیے الیکشن سر پر تھے، جلسے اور جلوسوں کی بھرمار تھی۔ ناول کا کردار غلام حیدر مسلم لیگ کے لیے ووٹ اکٹھے کرنے گاؤں گاؤں جاتا اور لوگوں کو اپنی طرف راغب کرتا۔ دو چار نعرے مسلم لیگ کے لگاتا اور اس کے ساتھ ہی تقریر کرنے لگ جاتا۔ ہندوستان میں ایسی صورت حال جنم لے چکی تھی کہ ہر کوئی اپنے حق کے لیے آواز بلند کر رہا تھا اور اس صورت حال میں انگریز حکومت کا یہاں رہنا ان کے لیے ذلالت سے کم نہ تھا۔ اس وجہ سے انگریز ہندوستان کو خیر باد کہتے ہوئے اپنے ملک واپس جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ غلام حیدر مسلمانوں کے حق کے لیے ان الفاظ میں آواز بلند کرتا تھا:

> یہ گورے، جن کے جوتوں کی پالش تمھارے پسینوں کے عرق سے تیار ہوتی ہے۔ یہ سب تمھارے ازلی دشمن ہیں۔ ان کی حکومت میں نہ تمھارا ایمان سلامت ہے، نہ تمھارے بال بچے۔ یہ سکھ، ہندو اور فرنگی کبھی تمھاری روزی روٹی کی حالت ٹھیک نہیں ہونے دیں گے۔ تم یاد رکھو اسی صورت بچ سکتے ہو، اگر ان کو اپنے سے دور کر دو گے اور ان سے نجات حاصل کر لو گے۔ ہم پھر بھی مسلمان ہیں۔ یہ سرور بہکاں والا غدار اور انگریز کا پٹھو ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انگریز ہندوستان میں رہے اور تمھاری آنے والی نسلیں بھی ان فرنگیوں کی غلامی کرتی رہیں۔ [۳۳]

یہ وہ دور تھا جب ہندوستانی عوام حقیقی آزادی کے لیے جدوجہد کرتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ کئی مشکلات اور آزمائشوں کے بعد جب ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا، اس وقت بھی ہندوستان کی عوام کو بہت سی قربانیاں دینی پڑیں۔ ان کی عزت، ان کی زندگیاں خطرے میں پڑ گئیں مگر انھوں نے اپنی جان و مال کی پرواہ کیے بغیر اپنے لیے الگ وطن حاصل کیا۔ یہ انقلاب کا دور تھا جب ہندوستان میں انقلاب برپا ہو رہا تھا۔ لوگوں نے اپنے جان و مال، اپنی

عزت کی پرواہ نہ کی مگر اپنے لیے الگ وطن ضرور حاصل کیا۔ یہ وہ مزاحمت ہے جو مزاحمت کے رویے سے نکل کر انقلاب میں داخل ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ ایسی بڑی تبدیلی کو مزاحمت نہیں انقلاب کا نام دیا جاتا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد اوکاڑہ پاکستان کے حصے میں آیا جہاں ولیم کی "نولکھی کوٹھی" تھی۔ انگریز تو ہندوستان چھوڑ کر جا چکے تھے مگر ولیم کو ہندوستان سے پیار تھا۔ اسے اس کوٹھی سے خاص لگاؤ تھا اس لیے وہ ہندوستان چھوڑ کر نہ گیا مگر ولیم نے بھانپ لیا تھا کہ پاکستانی گورنمنٹ مزید اس کی خدمات نہیں لے گی۔ وہ ایک انگریز تھا اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ آزادی سے پہلے ہم انگریزوں نے کس طرح ہندوستان سے فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ وقت ایسا تھا کہ اب یہ عوام انگریزوں کو آنکھیں دکھاتی تھی۔ اب وہ کسی کے غلام نہیں رہے تھے۔ اب نوبت یہاں تک آ جاتی ہے کہ پاکستانی حکومت کی طرف سے ولیم کو خط جاتا ہے جس میں دوٹوک الفاظ میں لکھا ہوتا ہے کہ:

> فی الحال آپ پاکستان کے شہری نہیں ہیں۔ اس لیے آپ کو بطور ڈپٹی کمشنر خدمات سونپنا کسی طرح ممکن نہیں۔ اس کے لیے سردست غور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اول آپ کو چاہیے تھا، پاکستان کی شہریت حاصل کرنے کے لیے گورنمنٹ کو درخواست دیتے۔ آپ کو خود فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں کہ آپ نے انگلستان کے بجائے پاکستان میں رہنے کو ترجیح دی ہے اور یہاں کی شہریت اختیار کر چکے ہیں۔ یہ اختیار صرف گورنمنٹ آف پاکستان کا ہے۔ [۴۴]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کی عوام جو کہ اب الگ الگ وطن میں رہ رہی تھی۔ اب انھیں انگریزوں سے کوئی خوف نہ تھا۔ انھیں حکم دیتے ہوئے کوئی ڈر نہ لگا۔ وہ انگریز جو ان پر حکومت کر رہے تھے۔ ان کے ڈپٹی کمشنر کو اس طرح دوٹوک الفاظ میں سمجھانا، جس کے سامنے ہندوستانیوں کی زبان نہیں کھلتی تھی، اسے اس طرح کے حکم دینا مزاحمت کی اعلیٰ مثال ہے۔ ولیم کو بھی اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اب حالات بالکل بدل گئے ہیں۔ کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا۔۔۔ اس کی وہ ساری عیش و عشرت ختم ہو گئی جو انگریز حکومت کے وقت تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ ولیم اس بات پر حیران بھی تھا کہ جس طرح انگریز حکومت دوٹوک الفاظ میں بات کرتی تھی۔ آج یہ لوگ ایک انگریز سے اسی لہجے میں بات کر رہے ہیں:

> ولیم خط پڑھ کر کچھ دیر کے لیے پریشان کھڑا رہا۔ خط کا پورا انداز واضح، دوٹوک اور برٹش بیورو کریسی کی عین بہ عین نقل تھا۔ گویا چیف سیکرٹری نے انہی کا تیر اس کی طرف پلٹا دیا تھا۔ ولیم کی نظر میں ایک دم اپنی افسری کے کئی واقعات یاد آنے لگے جس میں وہ بھی دیسی لوگوں کی درخواستوں پر کچھ اسی قسم کے دوٹوک احکامات صادر کرتا تھا اور دوبارہ نظر ثانی کرنے کی زحمت بھی نہیں کرتا تھا۔ اب اسے محسوس ہوا دوٹوک فیصلے دینے میں درخواست گزار کا کلیجہ کیسے پھٹتا ہے۔ [۴۵]

یہ وہ ڈپٹی کمشنر تھا جو اب مکمل طور پر پاکستانی حکومت پر انحصار کر رہا تھا جو خود لوگوں کو حکم جاری کیا کرتا تھا۔ اب اسے حکم سننے پڑ رہے ہیں۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اب اس کی حیثیت ایک معمولی سے انسان جیسی ہے۔

> ولیم نے سوچا، وہ کسی وکیل سے رجوع کرے۔ مگر پھر بھی اس خیال سے کانپ کر رہ گیا کہ یہ وکیل لوگ بھی تو دیسی ہیں۔[۳۶]

ہندوستانی نو آبادیات میں جب ہندوستان کا کوئی باشندہ حکومت سے مدد مانگنے کا سوچتا تو وہ بھی پہلے خوف میں مبتلا ہو جاتا۔ انگریز کہیں مدد کی بجائے کچھ برا نہ کر دے۔ یہی حال ولیم کا تقسیم ہند کے بعد ہو رہا تھا۔ وہ اسی کو غنیمت جان رہا تھا کہ جو زندگی کے دن بچے ہیں، اسے چپ کر کے گزار دیا جائے ورنہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

مجموعی طور پر اگر ناول میں نو آبادیات کے خلاف مزاحمتی عناصر کو دیکھا جائے تو اس میں مزاحمتی عناصر موجود ہیں مگر آغاز میں ڈھکے چھپے انداز میں ہیں۔ کیوں کہ اس وقت نو آبادیات کا دور عروج پر تھا اور اس وقت مزاحمت کا مطلب اپنے لیے مصیبت کھڑی کرنا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اور جنگِ عظیم کے وقت برطانوی حکومت کمزور ہوئی تو ہندوستانی عوام میں بھی آزادی حاصل کرنے کا جذبہ جاگا اور وہ آزادی کے لیے آواز اٹھانے لگ گئے۔ اب وہ انگریزوں کے سامنے بات کرنے سے ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس کے بعد جب ہندوستان تقسیم ہوا، اس وقت انگریزوں کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا گیا جیسا انھوں نے اقتدار میں رہتے ہوئے ہندوستانی عوام کے ساتھ رکھا تھا۔

حوالہ جات

۱۔ مولانا ابو الفضل، مصباح اللغات، مرتبہ: عبد الحفیظ (لاہور: مکتبہ قدسیہ، ۱۹۹۹ء)۔

۲۔ سید احمد دہلوی، فرہنگِ آصفیہ (لاہور: مشتاق بک کارنر، ۲۰۱۵ء)۔

۳۔ عبد اللہ خان خویشگی، فرہنگِ عامرہ (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۴ء)۔

۴۔ وارث سرہندی، علمی اردو لغت (لاہور: علمی کتاب خانہ، ۱۹۷۶ء)۔

۵۔ شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء)۔

۶۔ مولوی فیروز الدین، فیروز اللغات (لاہور: فیروز سنز، سن ندارد)۔

۷۔ ہارپر کولنز (Harper Collins)، *Collins Cobuild English Dictionary* (بھارت: نئی دہلی انڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ، ۱۹۹۱ء)، ص ۱۲۳۳۔

۸۔ https://dictionary.cambridge.org/dictionary/english/resistance، بتاریخ ۱۰ جون ۲۰۲۲ء، بوقت ۹:۰۰ بجے۔

۹۔ اے۔ ایس۔ ہارنی (A.S. Horny)، *Oxford Advanced Learner's Dictionary of Current English* (آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۶ء)۔

۱۰۔ طارق کلیم، اردو کی ظریفانہ شاعری میں مزاحمتی عناصر (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۸ء)، ص ۵۱۔

۱۱۔ اشفاق احمد، سعادت سعید، اردو میں مزاحمتی شاعری (تاریخ اور تجزیہ)، تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ اے، شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، سن ندارد، غیر مطبوعہ، ص ۲۴۔

۱۲۔ مولوی فیروز الدین، فیروز اللغات اردو (لاہور: فیروز سنز، سن ندارد)۔

۱۳۔ علی جاوید، افہام و تفہیم (دہلی: رائٹرز گلڈ (انڈیا)، ۲۰۰۰ء)، ص ۴۷۔

۱۴۔ http://www.deedbanmagazine.com/blog/aalmy-m2hmt-k-shryt، بتاریخ ۱۰ جون ۲۰۲۲ء، بوقت ۱۰:۰۰ بجے۔

۱۵۔ روبینہ سہگل، عورت اور مزاحمت (لاہور: مشعل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء)، ص ۱۹۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۳۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۳۔

۱۸۔ آغا ظفر حسین، مزاحمت اور پاکستانی اردو شاعری (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۶ء)، ص ۲۵۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۰۔

۲۰۔ http://www.hrw.org/ur/report/2021/04/27/378469، بتاریخ ۱۵ جون ۲۰۲۲ء، بوقت ۱۰:۰۰ بجے۔

۲۱۔ آغا ظفر حسین، مزاحمت اور پاکستانی اردو شاعری، ص ۲۶۔۲۷۔

۲۲۔ انوار احمد، عالمی مزاحمتی شاعری مشمولہ ماہ نو ، جلد ۴۱، سہ ماہی (لاہور: فروری ۱۹۸۹ء)، ص ۲۳۔

۲۳۔ کولن جانز (Colin Jones)، *Cambridge Illustrated History of France* (کیمبرج: ۱۹۹۴ء)، ص ۲۷۳۔

۲۴۔ باربرا ہارلو (Barbara Harlow)، *Resistance Literature* (نیویارک: میتھیون، ۱۹۸۷ء)۔

۲۵۔ حسن رضوی، مرتب: شہرت بخاری سے انٹرویو، بحوالہ انداز گفتگو (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء)۔

۲۶۔ صادق آئینہ وند، ادبیات مقاومت بحوالہ کیہان (فارسی رسالہ) سال ہشتم، شمارہ ۷۰، سن ندارد۔

۲۷۔ سلیم اختر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ۔ آغاز سے ۲۰۰۰ء تک (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء)، ص ۶۲۴۔۶۲۶۔

۲۸۔ انیس ناگی، مشاہدات (لاہور: مکتبہ جمالیات، ۱۹۹۳ء)، ص ۴۲۔۴۳۔

۲۹۔ خواجہ محمد زکریا، اردو نظم کے پچاس سال مشمولہ پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال: مرتبہ ڈاکٹر نوازش علی (راول پنڈی: ۱۹۹۷ء)، ص ۸۳۔۸۴۔

۳۰۔ رشید امجد۔ اردو میں مزاحمتی ادب کی روایت مشمولہ مزاحمتی ادب، ص ۲۵۔

۳۱۔ عتیق احمد، اردو ادب میں احتجاج (لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۷ء)، ص ۲۸۔

۳۲۔ تبسم کاشمیری، اردو ادب کی تاریخ (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص ۲۵۶۔

۳۳۔ روبینہ سہگل، عورت اور مزاحمت، ص ۴۸۔

۳۴۔ سردار جعفری، ترقی پسند ادب (لاہور: مکتبہ پاکستان، سن ندارد)، ص ۱۵۲۔

۳۵۔ سلیم اختر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ص ۴۴۱۔

۳۶۔ عصمت چغتائی، پیش لفظ مشمولہ ٹیڑھی لکیر (لکھنو: نصرت پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء)، ص۷۔

۳۷۔ علی اکبر ناطق،نو لکھی کوٹھی (جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۴ء)، ص۸۹۔

۳۸۔ ایضاً، ص۱۳۳۔

۳۹۔ ایضاً، ص۲۰۳۔

۴۰۔ ایضاً، ص۲۲۸۔

۴۱۔ ایضاً، ص۲۶۴۔

۴۲۔ ایضاً، ص۳۴۳۔

۴۳۔ ایضاً، ص۳۶۴۔

۴۴۔ ایضاً، ص۴۰۳۔

۴۵۔ ایضاً، ص۴۰۳۔۴۰۴۔

۴۶۔ ایضاً، ص۴۰۴۔

ماحصل

ماحصل

نو آبادیات (Colonialism) عہد حاضر کی ایک اہم اصطلاح ہے۔ نو آبادیات ایک ایسا نظام ہے جس میں ایک طاقت ور ریاست کسی دوسری کمزور ریاست میں جا کر اپنی آبادیاں قائم کرتی ہے اور دوسری ریاست کو ہر طرح سے مغلوب کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس ریاست پر اپنے قوانین مسلط کرنا اور وہاں کے قدرتی وسائل اور افراد کی قوت کو اپنے مفاد اور معاشی ترقی کے لیے استمال کرنا ان کے مقاصد میں شامل ہوتا ہے۔ غالب ریاست کو ہر سطح پر فائدہ ہوتا ہے۔ اس نظام میں طاقت ور ریاستیں کمزور ریاستوں کا استحصال کرتی ہیں اور خود کو مضبوط اور مستحکم کرتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مقبوضہ ریاست کے تمام تر شعبوں پر قابض ہو کر اور انھیں استعمال میں لا کر اپنی معاشی صورت حال کو مضبوط کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ کمزور ریاست کے تمام تر حکومتی امور بھی اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہیں۔ چوں کہ یہ مقبوضہ ریاست سے ہر سطح سے مضبوط اور ترقی یافتہ ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ خود کو مقبوضہ ریاستوں سے برتر سمجھتی ہیں۔ جس کی وجہ سے اس میں دوسری ریاستوں اور ان کے وسائل پر قبضہ کرنے کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔ اس طرح وہ دن بدن مضبوط ہو کر مزید ترقی یافتہ ریاستوں میں شامل ہوتی چلی جاتی ہیں۔

تاریخ عالم میں ریاستوں کی توسیع کے دوران کمزور ریاستوں پر قبضہ ایک عام روایت ہے۔ کمزور ریاستوں کو غلامی کے عذاب جھیلنا پڑتے ہیں اور تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ زمانہ قدیم میں رومیوں کی فتوحات اس ضمن میں اہم مثال ہے۔ نو آبادیاتی نظام میں کسی کمزور ریاست کا استحصال ہی نہیں کیا جاتا بلکہ ان کی نفسیاتی اور اخلاقی زندگی کو بھی بری طرح متاثر کیا جاتا ہے۔ اس نظام کے تحت قابض ریاست مقبوضہ ریاست کے قدرتی وسائل سے استفادہ تو کرتی ہے مگر ان کے حقوق کا تحفظ نہیں کرتی۔ دونوں ریاستوں کے مابین نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ قابض ریاست انھیں ہر طرح سے بدتر سمجھتی ہے۔ ان کے رہن سہن، ثقافت، روایات یہاں تک کہ ان کے مذہب کو بھی کم تر سمجھا جاتا ہے۔

نو آبادیاتی نظام کے حمایتی اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ کمزور ریاستوں کو سہولیات فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی حالت بہتر کر سکتے ہیں۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہوتا۔ کمزور ریاستوں پر قبضہ کر کے خود کو مضبوط کیا جاتا ہے۔ اپنی معاشی ترقی کو مضبوط کیا جاتا ہے اور اس کے لیے وہ اپنی فوجی طاقت استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

اردو ناول پر نو آبادیات کے اثرات کو دیکھنے کے لیے اس مقالے میں علی اکبر ناطق کے ناول ''نولکھی کوٹھی'' میں نو آبادیات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول کی نو آبادیاتی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس مقالے کی بنیاد ان سوالات پر رکھی گئی ہے۔

۱۔ ''نولکھی کوٹھی'' میں نو آبادیات کے کن تصورات کو پیش کیا گیا ہے؟

۲۔ ناول میں واقعات اور کرداروں کے ذریعے غلامانہ فکر کی عکاسی کیسے کی گئی ہے؟

۳۔ ناول میں اسلوب کی مدد سے نو آبادیاتی اثرات کو کیسے نمایاں کیا گیا ہے؟

۴۔ ناول میں مزاحمتی رویوں کو کیسے پیش کیا گیا ہے؟

ان سوالات کے پیشِ نظر مقالے کو تحریر کیا گیا ہے اور ہر ممکن کوشش کی گئی ہے کہ تمام سوالات کے جوابات شامل کیے جائیں۔

ناول ''نولکھی کوٹھی'' میں نو آبادیاتی تصورات کو مد نظر رکھا گیا ہے کہ کالونائزر (Colonizer) اور کالونائزڈ (Colonized) میں واضح فرق موجود ہے۔ انگریز جو ہندوستان پر حکومت کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ ہندوستانی عوام کو خود سے بدتر سمجھتے ہیں اور خود میں اور ان میں ہمیشہ ایک فرق برقرار رکھتے ہیں تاکہ انھیں اس بات کا احساس رہے کہ وہ ہمارے غلام ہیں۔ بظاہر اس عوام کے امن اور خوش حالی کے لیے اقدامات کیے جاتے ہیں مگر ان کے پس پردہ انگریزوں کے اپنے مفادات ہوتے ہیں جنھیں وہ پورا کرنے کے لیے یہ اقدامات کر رہے ہوتے ہیں۔ ہندوستانی عوام کو حکومتی امور میں عمل دخل نہیں ہوتا، اگر ہندوستان کا کوئی باشندہ یہ حماقت کرتا ہے تو اسے دوٹوک الفاظ میں سمجھا دیا جاتا ہے کہ یہ کام کرنے کے لیے ہم موجود ہیں۔ آپ میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ یہ فیصلے کر سکو۔ ہندوستانی عوام کو جو وسائل مہیا کیے جاتے ہیں وہ اس بات کو مد نظر رکھ کر دیے جاتے ہیں کہ کیا یہ ہمارے راستے میں رکاوٹ کا باعث تو نہیں بنیں گے۔

علی اکبر ناطق نے کرداروں کے ذریعے بھی نو آبادیاتی جبر کو پیش کیا ہے۔ ایسے کردار تخلیق کیے جو نو آبادیاتی نظام کی عکاسی کرتے ہوں۔ ان میں سے کچھ کردار ایسے ہیں جو انگریزوں کی غلامی کو اپنا مقدر سمجھتے ہیں اور ان سے ڈرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ کچھ کردار ایسے بھی ہیں جنھیں معلوم ہے کہ انگریز حکومت صرف اپنے مفادات کو سامنے رکھتی ہے۔ وہ ہمارے ساتھ کبھی بھی مخلص نہیں ہو سکتی۔ ملک بہزاد کی مثال اس کے لیے پیش کی جا سکتی ہے جو انگریزوں کی چالوں سے واقف ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مولوی کرامت علی ایک ایسا کردار ہے جو ہمیشہ انگریز حکومت کی خوشامد میں مصروف رہتا ہے کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر ان کی غلامی کی، ان کے حکم پر عمل کیا تو یہ مجھے ترقی کی طرف لے جائیں گے۔ علی اکبر ناطق نے اس ناول میں ایسے کردار تخلیق کیے ہیں جو پورا نو آبادیاتی

ماحول پیش کرتے ہیں۔ اس میں کچھ بنیادی کردار ہیں، کچھ ضمنی کردار ہیں۔ کرداروں کے ایسے نام رکھے گئے ہیں کہ ان کے ناموں سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ نام کسی ہندوستانی کا ہے اور یہ نام کسی انگریز کا۔

علی اکبر ناطق نے ناول "نولکھی کوٹھی" میں اپنا اسلوب تراشنے کی کوشش کی ہے یعنی اس میں اردو زبان کے ساتھ ساتھ پنجابی اور انگریزی زبان بھی استعمال کی ہے۔ ناول کا اسلوب نوآبادیاتی فضا میں لپٹا ہوا ہے۔ ناول کا اسلوب آغاز سے اختتام تک نوآبادیاتی نظام کی عکاسی کرتا ہے۔ ناول میں انگریزوں کے عروج و زوال کی مکمل کہانی موجود ہے۔ انگریزوں کی نظر میں ہندوستان ایک سونے کے انڈے دینے والی مرغی کی طرح تھا جس کے وسائل سے انگریز اس حد تک منافع کمانا چاہتے تھے جب تک وہ ختم نہ ہو جائیں۔ ناول میں ہندو اور مسلم معاشرے کی تصویر ملتی ہے۔ ناول کی زبان شستہ اور سادہ ہے۔ قاری کو پڑھتے ہوئے کسی پریشانی کا سامنا نہیں ہوتا۔ پنجابی الفاظ، پنجابی دیسی طریقہ جس طرح بیان کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ حقیقت نگاری کو مدنظر رکھتے ہوئے ناول نگار نے پنجاب کی آبادی، طبقاتی تقسیم اور انگریزوں کی چالوں کو ایک نمونے کے طور پر پیش کیا ہے۔

ناول میں مزاحمتی رویوں کو بھی پیش کیا گیا ہے مگر مزاحمتی رویوں کی بات کی جائے تو جنگِ عظیم دوم کے بعد مزاحمتی رویے کھل کر سامنے آتے ہیں۔ اس سے پہلے تو انگریز حکومت عروج پر تھی۔ اس وقت ان کے سامنے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی جاتی تھی۔ اگر کوئی یہ ہمت کرتا تو وہ بھی ڈھکے چھپے الفاظ میں اور انگریز حکومت کے پیٹھ پیچھے ان کے خلاف کوئی بات کر دیتا۔ ناول کے آغاز سے لے کر جنگِ عظیم دوم تک مزاحمت نے بغاوت کا رنگ اپنایا ہوا تھا۔ جب جنگِ عظیم دوم شروع ہوئی تو اس کے بعد صورت حال بدل گئی اور ہندوستانی عوام سرعام مزاحمت پر اتر آئی اور وہ مزاحمت ایسے جوش اور جذبے سے کی گئی کہ اس نے انقلاب کا روپ اپنا لیا جس کی بنا پر ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا اور انگریز یہاں سے واپس چلے گئے۔ تقسیم ہند کے بعد بھی ناول میں مزاحمت دیکھنے کو ملتی ہے۔ ولیم جو ہندوستان میں مقیم رہتا ہے اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا جاتا ہے جیسا کہ انگریز حکومت ہندوستانی عوام کے ساتھ کرتی تھی۔

مزاحمتی ادب کی اصطلاح بیسویں صدی کی ابتدا میں رائج ہوئی اور اس کا اطلاق استعمار کی گرفت میں جکڑے افراد پر ہوتا ہے۔ مزاحمتی ادب کو استعماری قوتوں کے مقابل ایک موثر تخلیقی جدوجہد کے طور پر قبول کیا گیا۔ ناول "نولکھی کوٹھی" میں بھی مزاحمت کو سامراجی قوتوں کے خلاف استعمال کیا گیا اور اس وقت نوآبادیات کے نظام سے ہندوستان میں جو استحصال ہو رہا تھا، ہندوستانی عوام کا حق مارا جا رہا تھا۔ ناول میں اس کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار ملتا ہے۔ مقالے میں ناول "نولکھی کوٹھی" کے مزاحمتی رویوں کو دلائل اور اقتباسات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے تاکہ قاری مزاحمتی رویوں سے شناسا ہو سکے۔ چوں کہ علی اکبر ناطق کا اسلوب اس

وقت کے مصنفین سے مختلف ہے۔ ناقد کے اسلوب کو دیکھا جائے تو انھوں نے روایت سے ہٹ کر کام کیا۔ اس زمانے کے مشکل الفاظ کو اپنی تحریر میں لایا۔ نو آبادیاتی نظام کے حوالے سے جو خیالات ان کے ذہن میں تھے انھیں الفاظ کی مدد سے لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی۔ الفاظ کا ایسا چناؤ کیا کہ قاری خود بخود اسی ماحول میں پہنچ جاتا ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں جہاں ضرورت پیش آئی وہاں دلائل کے ساتھ اقتباسات کو پیش کیا گیا تاکہ مصنف کی فکر اور اسلوب کو موثر انداز میں بیان کیا جاسکے۔

اس مقالے میں نو آبادیاتی تناظر میں ناول کی کردار نگاری، اسلوب اور مزاحمتی عناصر کے تمام تجربات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے جس کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اس ناول میں نو آبادیاتی نظام کی تکنیک کو کامیابی سے برتا گیا ہے۔ ناول کی پوری فضا نو آبادیاتی نظام کی عکاسی کرتی ہے۔

کتابیات

کتابیات

The Encyclopedia Americana۔USA:Grolies Incorporated، ۱۹۹۲ء۔

The World Book of Encyclopedia۔امریکہ، ۱۹۹۸ء۔

ابوالفضل، مولانا۔مصباح اللغات، مرتبہ: عبدالحفیظ۔لاہور: مکتبہ قدسیہ، ۱۹۹۹ء۔

احمد، عتیق۔"لندن کی ایک رات: ایک نو آبادیاتی مطالعہ" مشمولہ سجاد ظہیر: ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک، مرتبہ: گوپی چند نارنگ۔لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔

احمد، عتیق۔اردو ادب میں احتجاج۔لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۷ء۔

احمد، عتیق۔" لندن کی ایک رات: موضوع اور مواد"مشمولہ سجاد ظہیر: شخصیت اور فن و فکر (مرتبہ)۔لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔

احمد، اشفاق، سعید، سعادت۔اردو میں مزاحمتی شاعری (تاریخ اور تجزیہ)۔تحقیقی مقالہ برائے ایم۔اے،

شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، سن ندارد، غیر مطبوعہ۔

احمد، انوار۔عالمی مزاحمتی شاعری مشمولہ ماہ نو۔جلد ۴۱، سہ ماہی۔لاہور: فروری ۱۹۸۹ء۔

احمد، ڈپٹی نذیر۔کلیات ڈپٹی نذیر احمد۔لاہور: خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۵ء۔

احمد، ڈپٹی نذیر۔ابن الوقت۔دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۷۳ء۔

اختر، سلیم۔اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ۔ آغاز سے ۲۰۰۰ء تک۔لاہور: سنگِ میل پبلی

کیشنز، ۲۰۰۲ء۔

انسائیکلوپیڈیا۔ *The New International Webster's comprehensive Dictionary of the English Language*، جلد ۱۔نیپلز: ٹرائیڈن ریفرنس پبلشنگ،

۲۰۰۶ء۔

بٹ، محمد عاصم۔عبد اللہ حسین: شخصیت اور فن۔اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء۔

بخاری، اشفاق حسین۔ اسلوبیاتی مباحث۔ اسلام آباد: شاخِ زریں، ۲۰۱۶ء۔

بیگ، مرزا خلیل۔ زبان اور اسلوبیات۔ علی گڑھ: مکتبہ جامع لمیٹڈ یونی ورسٹی مارکیٹ، ۱۹۸۳ء۔

بیگ، خلیل احمد۔ تنقید اور اسلوبیاتی تنقید۔ علی گڑھ: مسلم یونی ورسٹی، ۲۰۰۵ء۔

بیگ، خلیل احمد۔ اطلاقی لسانیات۔ علی گڑھ: مسلم یونی ورسٹی، ۲۰۰۳ء۔

بیوروئی، ہیڈی (Bouraoui ,Hedi) ۔ *Albert Memmi by Judith Roumani* *Research in African Literatures*۔ ۱۹۸۹ء۔

ٹوانہ، محمد خرم۔ اداس نسلیں کا سیاسی منظر نامہ مشمولہ عبد اللہ حسین ایک مطالعہ مرتبہ سید عامر سہیل۔ لاہور: بیکن بکس، ۲۰۱۶ء۔

جالبی، جمیل۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ۔ شاعری کی تین آوازیں۔ سن ندارد۔

جالبی، جمیل۔ قومی انگلش اردو ڈکشنری۔ ۱۹۸۲ء۔

جانز، کولن (Jones, Colin)۔ *Cambridge Illustrated History of France*۔ کیمبرج: ۱۹۹۴ء۔

جاوید، علی۔ افہام و تفہیم۔ دہلی: رائٹرز گلڈ (انڈیا)، ۲۰۰۰ء۔

جعفری، سردار۔ ترقی پسند ادب۔ لاہور: مکتبہ پاکستان، سن ندارد۔

چغتائی، عصمت، پیش لفظ مشمولہ ٹیڑھی لکیر۔ لکھنؤ: نصرت پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء۔

چند، پریم۔ "گئودان" مشمولہ مجموعہ پریم چند۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔

حسین، آغا ظفر۔ مزاحمت اور پاکستانی اردو شاعری۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۶ء۔

حسین، عبد اللہ۔ اداس نسلیں۔ لاہور:: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء۔

حقی، شان الحق۔ فرہنگ تلفظ۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء۔

خان، سر سید احمد۔ " اسباب بغاوت ہند" مشمولہ خیال نمبر، مرتبہ: ناصر کاظمی، انتظار حسین۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء۔

خویشگی، عبد اللہ خان۔ فرہنگِ عامرہ۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ ۲۰۰۴ء۔

خویشگی، محمد عبد اللہ خان۔ فرہنگِ عامرہ۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، طبع اول، جون ۱۹۸۹ء۔

دہلوی، سید احمد۔ فرہنگِ آصفیہ۔ لاہور: مشتاق بک کارنر، ۲۰۱۵ء۔

راشدی، وفا۔ بنگال میں اردو۔ دہلی، مطبوعہ اردو پبلشنگ ہاؤس، سن ندارد۔

راہی، اعجاز۔اردو افسانے میں اسلوب کا آہنگ۔راول پنڈی: ریز پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔
رضوی، حسن۔ مرتب: شہرت بخاری سے انٹرویو، بحوالہ اندازِ گفتگو۔لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء۔
زکریا، خواجہ محمد۔اردو نظم کے پچاس سال مشمولہ پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال: مرتبہ ڈاکٹر نوازش علی۔راول پنڈی: ۱۹۹۷ء۔
زکریا، خواجہ محمد۔اکبر الہٰ آبادی : تحقیقی و تنقیدی مطالعہ۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔
زیدی، شمع افروز۔اردو ناول میں طنز و مزاح۔لاہور: پروگریسو بکس، ۱۹۹۸ء۔
سٹینگراس، الیف۔ (Steingrass, F.)۔ *A Dearner's Arabic-English Dictionary*۔ایشیَن پبلشرز، ۱۹۷۸ء۔
سدید، انور۔اردو ادب کی تحریکیں۔کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان۔
سرہندی، وارث۔علمی اردو لغت۔لاہور: علمی کتاب خانہ، ۱۹۷۶ء۔
سعد، ابراہیم۔*Little Oxford English Urdu Dictionary*۔آکسفورڈ یونی ورسٹی، پریس، ۲۰۱۳ء۔
سعید، ایڈورڈ۔ثقافت اور سامراج مترجم: یاسر جواد۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۰ء۔
سہگل، روبینہ۔عورت اور مزاحمت۔لاہور: مشعل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء۔
سہیل، سید عامر (مرتبہ)۔عبد اللہ حسین ایک مطالعہ۔لاہور: بیکن بکس، ۲۰۱۶ء۔
شرائن، اے۔ای۔ڈاربے (Shrine, A.E. Darby)۔ *A Grammar of Style*۔لندن: اینڈرے ڈیوسائی، ۱۹۷۱ء۔
صدیق، عارف۔" اداس نسلیں کا کردار مطالعہ نو آبادیاتی تناظر میں" مشمولہ عبد اللہ حسین ایک مطالعہ، مرتبہ: سید عامر سہیل۔لاہور: بیکن بکس، ۲۰۱۶ء۔
صدیقی، ابو الاعجاز حفیظ۔کشاف تنقیدی اصطلاحات۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء۔
ظہیر، سجاد۔لندن کی ایک رات۔لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۷۴ء۔
عابد، سید عابد علی۔ اسلوب۔لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع دوم، ۱۹۹۶ء۔
عبداللہ، سید۔اشاراتِ تنقید۔لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء۔
عقیل، معین الدین۔فتح نامہ ٹیپو سلطان۔لاہور: گنج شکر پرنٹرز، ۱۹۹۹ء۔
علی، مبارک۔تاریخ اور تحقیق۔لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء۔

فاروقی، شمس الرحمان۔افسانے کی حمایت میں۔بھارت: مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ، ۱۹۸۲ء۔

فاروقی، محمد احسن۔نورالحسن ہاشمی،ناول کیا ہے؟ یعنی ناول نگاری کا تکنیک۔لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۴ء۔

فرانز،فینن۔افتادگان خاک۔مترجمین: محمد پرویز، سجاد باقر رضوی۔لاہور: نگارشات، ۱۹۹۶ء۔

فیروزالدین،مولوی۔فیروز اللغات۔لاہور: فیروز سنز، سن ندارد۔

فیروزالدین،مولوی۔فیروز اللغات اردو۔لاہور: فیروز سنز، سن ندارد۔

فیروزالدین،الحاج مولوی۔فیروز اللغات۔لاہور: فیروز سنز، ۱۹۵۲ء۔

فیروزالدین۔فیروز اللغات۔ اردو جامع۔لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، سن ندارد۔

کاشمیری، تبسم۔اردو ادب کی تاریخ،لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔

کامران، طاہر۔"کولونیل ازم: نظریہ اور برصغیر پر اس کا اطلاق" مشمولہ تاریخ، شمارہ ۲۲۔لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۴ء۔

کلیم، طارق۔ اردو کی ظریفانہ شاعری میں مزاحمتی عناصر۔کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۸ء۔

کولنز، ہارپر (Harper, Collins)۔ *Collins Cobuild English Dictionary*۔بھارت: نئی دہلی انڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ، ۱۹۹۱ء۔

مرزا، اشفاق سلیم۔مقالات تاریخ و فلسفہ۔لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۷ء۔

ملک، عبداللہ۔بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جدوجہد آزادی: ۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء۔لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۷ء۔

نارنگ، گوپی چند۔ادبی تنقید اور اسلوبیات۔لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء۔

ناطق، علی اکبر۔بے یقین بستیوں میں (نظمیں)۔کراچی: سٹی پریس بک شاپ، ۲۰۱۰ء۔

ناطق، علی اکبر۔نولکھی کوٹھی۔جہلم: بک کارنر جہلم، ۲۰۱۴ء۔

ناطق، علی اکبر۔قائم دین (افسانے)۔کراچی: اوکسفورڈیونی ورسٹی پریس، ۲۰۱۲ء۔

ناطق، علی اکبر۔یاقوت کے ورق۔کراچی: سٹی پریس بک شاپ، ۲۰۱۳ء۔

ناگی، انیس۔مشاہدات۔لاہور: مکتبہ جمالیات، ۱۹۹۳ء۔

نجم الہدی۔کردار اور کردار نگاری۔پٹنہ: کتاب منزل سبزی باغ،۱۹۸۰ء۔
نیر، ناصر عباس۔"نو آبادیاتی صورت حال" مشمولہ لسانیات اور تنقید۔اسلام آباد: پورب اکادمی،۲۰۰۹ء۔
نیر، ناصر عباس۔لسانیات اور تنقید۔اسلام آباد: پورب اکادمی،۲۰۰۹ء۔
ہارلو، باربرا (Harlow ,Barbara)۔ *Resistance Literature* ۔نیویارک: میتھیون، ۱۹۸۷ء۔
ہارنی ,اے۔ایس۔ (Horny, A.S.)۔ *Oxford Advanced Learner's Dictionary of Current English*۔آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس،۱۹۹۶ء۔
وند، صادق آئینہ۔ادبیات مقاومت بحوالہ کیہان(فارسی رسالہ) سال ہشتم، شمارہ ۰۷، سن ندارد۔

ویب سائٹس(Websites):

www.collinsdictionary.com/dictionary/english/character، بتاریخ ۱۰ مئی ۲۰۲۲ء، بوقت ۲:۰۰ بجے۔
http://dictionary.cambridge.org/amp/english/character، بتاریخ ۱۰ مئی ۲۰۲۲ء، بوقت ۱۲:۰۰ بجے۔
http://www.deedbanmagazine.com/blog/aalmy-m2hmt-k-shryt، بتاریخ ۱۰ جون ۲۰۲۲ء، بوقت ۱۰:۰۰ بجے۔
http://www.hrw.org/ur/report/2021/04/27/378469، بتاریخ ۱۵ جون ۲۰۲۲ء، بوقت ۱۰:۰۰ بجے۔
http://www-collinsdictionary.com/dictionary/english /colonialism تاریخ ملاحظہ ۱۰ نومبر ۲۰۲۱ء بوقت ۱۰:۰۰ بجے۔
https://dictionary.cambridge.org/dictionary/english/resistance، بتاریخ ۱۰ جون ۲۰۲۲ء، بوقت ۹:۰۰ بجے۔